اعتبارِ وفا

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔
ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔
مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غُنچے وہیں کھلتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دُھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں

قسط:21

''کیا بک رہا ہے؟'' شاہجہان بیگم نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ تپائی پر رکھا۔
''بک نہیں رہا شاہجہان بیگم..... حاتی دادا کو دیکھا ہے میں نے اُدھر..... سچ کہہ رہا ہوں۔''
''اچھا.....'' شاہجہان بیگم کے لہجے میں تمسخر در آیا اور وہ سنبھل چکی تھی۔
''ہاں..... جیسے پہلے دیکھا تھا۔''

''نہیں اللہ قسم سچ کہہ رہا ہوں، میں نے خود اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھا۔ بہت دیر تک دیکھتا رہا اور پھر تصدیق بھی کرلی.....'' اور شاہجہان بیگم کا دل ایک بار پھر بے ہنگم انداز میں دھڑکنے لگا۔
''اچھا بیٹھ جا ادھر اور آرام سے بتا کہاں دیکھا اور کس سے تصدیق کی۔'' اندر ہوتی بے ترتیب دھڑکنوں کے برعکس شاہجہان بیگم کا لہجہ نارمل تھا۔
''وہ..... اُدھر اسپتال میں دیکھا..... گاڑی سے اتر کر اندر جارہا تھا۔ شاید کوئی عزیز بیمار ہے اس کا اور وہاں اس اسپتال میں داخل ہے اور وہ ہر روز وہاں جاتا ہے۔'' شیدا صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔
''اچھا تو اب اسپتال کے باہر دھرنا مار کر بیٹھ جائیں کہ وہ کب اسپتال آتا ہے۔ واہ کیا خبر لایا ہے تو!'' شاہجہان بیگم نے ایک طنزیہ سی نظر اس پر ڈالی۔
''توبہ ہے شاہجہان بیگم..... چھری تلے دم تو لینے دو..... پوری بات سن لو پھر تبصرہ کرنا۔'' شیدے کے لہجے

سے ناراضی جھلکنے لگی۔ شاہجہان خاموش ہی رہی لیکن اس کی سوالیہ نظریں شیدے کے چہرے پر تھیں۔ شیدے نے شاہجہان بیگم کی بے چینی کو محسوس کیا اور مدھم سا مسکرایا۔

''میں وہاں اسپتال کے گیٹ کے پاس جم کر کھڑا ہوگیا اور نظریں اندر سے باہر نکلنے والوں پر لگا دیں۔'' شیدے کو لمبی بات کرنے کی عادت تھی۔ شاہجہان کو کوفت ہو رہی تھی لیکن وہ زبان بند کیے اس کی بات سن رہی تھی۔

''کچھ دیر بعد وہ گیٹ سے نکل کر پارکنگ کی طرف جانے لگا تو میں اس کے پیچھے چل پڑا اور چند قدم چلنے کے بعد اسے آواز دی۔ ''حاتی دادا'' اور اس نے یک دم مڑ کر پیچھے دیکھا...... قسم سے شاہجہان بیگم اس نے مجھے پہچان لیا تھا لیکن فوراً ہی انجان بن کر پوچھنے لگا۔ ''آپ نے کسے بلایا ہے؟ میں نے بھی قریب جا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔''

''اب بک بھی چک، یہ لمبی داستان نہ سنا مجھے۔'' شاہجہان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا...... لیکن شیدا ابھی اس کے صبر کا امتحان لے رہا تھا۔ ایسا موقع تو کبھی کبھی ہی ملتا تھا اسے، ورنہ ظہورے کے سامنے اس کی دال نہیں گلتی تھی۔

''اور کیا...... حاتی دادا کیا پہچانا نہیں مجھے، میں شیدا ہوں...... شیدا لمبا تو بولا 'میں نے نہیں پہچانا۔ میرا نہیں خیال کہ آج سے پہلے کبھی میری ملاقات آپ سے ہوئی ہو......'' میں نے کہا چلو مجھے نہیں پہچانا تو کوئی بات نہیں میں بیچارہ نہ تین میں نہ تیرہ میں...... تمہیں شاہجہان بیگم تو یاد ہوگی ناں...... اُدھر شاہی محلے میں اس کے چوبارے پر آیا کرتے تھے تم...... تو کہنے لگا'' میں نہیں جانتا کسی شاہجہان بیگم کو اور نہ ہی اس کے چوبارے کو یہ کہہ کر وہ......''

''تیری کہانی ختم ہوئی ہو تو یہ بتا دے کہ اس کا اتا پتا معلوم کیا؟ کہاں رہتا ہے؟ میرا پیغام دیا؟'' شاہجہان بیگم نے اس کی بات کاٹی۔

''ایک تو تم شاہجہان بیگم پوری بات نہ سننا...... بیچ میں ٹوک دینا۔'' شیدے نے برا سا منہ بنایا۔

''اب کوئی تم سے پوچھے کہ جو شخص اپنے نام سے مکر رہا تھا وہ بھلا مجھے اپنا اتا پتا بتاتا۔ البتہ تمہارا پیغام دے دیا کہ شاہجہان بیگم کو تم سے کوئی ضروری کام آپڑا ہے۔ ڈھونڈتی پھر رہی ہے تجھے، دو گھڑی کے لیے ملنے آجاؤ...... گھر کا پتا بھی اچھی طرح سمجھا دیا...... ابھی دوبارہ سمجھانا چاہتا تھا کہ جھٹ سے گاڑی میں بیٹھ گیا اور بولا۔'' وہ نہ مجھے جانتا ہے نہ کسی شاہجہان بیگم کو ضرور مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اور شاہجہان بیگم نے سر پکڑ لیا۔

''پتا نہیں کس بندے کو حاتی دادا سمجھ لیا تو نے۔''

''قسم سے شاہجہان بیگم، شیدے کی نظر دھوکا نہیں کھاتی۔ تم اچھی طرح جانتی ہو، شیدا ایک بار کسی کو دیکھ لے تو سو سال بعد بھی پہچان لے...... تو کل میرے ساتھ چل کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا اگر میں نے غلط کہا ہو تو جو چور کی سزا وہ میری۔''

''اچھا ابھی تو جا میرا دماغ نہ کھا، ایک وہ ظہورا کم دماغ کھا کر گیا ہے میرا۔''

شیدا بڑبڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھہر......'' شاہجہان کو یک دم خیال آیا کہ وہ اسپتال میں کیا کرنے گیا تھا۔

''تو وہاں اسپتال میں کیا کر رہا تھا؟''

''وہ میں......'' شیدا جاتے، جاتے رک گیا۔

''سنہری نے بھیجا تھا مجھے پروفیسر کے بیٹے کی خیریت معلوم کرنے۔''

''اوہ...... ہاں کیسا ہے وہ؟ سنہری نے بتایا تو تھا۔ کیا زیادہ چوٹیں آئی تھیں۔''

''پتا نہیں، میں اندر تو گیا ہی نہیں...... حاتی دادا کو جو دیکھ لیا تھا۔''

شیدا سر میں انگلیاں چلاتا ہوا چلا گیا تو شاہجہان نے پاس کھڑی موراں کو چائے کا کپ اٹھانے کا اشارہ کیا
''موراں، یہ چائے لے جا اور گرم کر کے لے آ...... اس کمبخت شیدے کی اسٹوری میں ٹھنڈی ہوگئی اور ہاں یہ سنہری، موتیا، بجو کہاں مری پڑی ہیں۔ انہیں بتایا نہیں میرے آنے کا گھنٹوں سے آئی بیٹھی ہوں...... ایک بھی نیچے نہ اتری۔''
''سنہری تو نہار ہی تھی اور تم جانو وہ ایک بار غسل خانے میں گھس جائے تو گھنٹے لگا کر نکلتی ہے اور موتیا سو رہی تھی۔ بیچاری موتیا کو تو بخار نے توڑ کر رکھ دیا ہے، دوائی کھا کر سوئی تھی۔ میں نے جگایا نہیں اور بجو تو پڑھ رہی تھی یہ موٹی سی کتاب...... اور تم نے خود ہی کہہ رکھا ہے کہ وہ اگر پڑھ رہی ہو تو اسے مت بلانا اور میں نے......''
''توبہ ہے موراں، تم سب لوگوں نے کیا آج پوری، پوری کہانیاں سنانی ہیں مجھے۔'' شاہجہان نے اس کی بات کاٹی۔ موراں نے چائے کا کپ اٹھالیا۔
''موراں......'' سنہری سیڑھیوں پر نمودار ہوئی۔
''اگر چائے فالتو ہو تو مجھے بھی تھوڑی سی دے دو۔'' اور پھر دو، دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے اتر کر شاہجہان بیگم کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے دونوں رخساروں کو چوما۔
''چل ہٹ پرے......'' شاہجہان نے اسے پیچھے دھکیلا۔
''یہ جھوٹے لاڈ نہ دکھا صبح سے آئی بیٹھی ہوں اور توفیق نہیں ہوئی نیچے اترنے کی۔''
''اتنی گندی سندی بیٹھی تھی، تین دن کے میلے کپڑے...... سوچا نہا دھو کر صاف ستھری ہو کر اپنی اماں کا استقبال کروں۔'' وہ شاہجہان بیگم کے پاس ہی بیٹھ گئی۔
''اچانک ہی گئی ہو اور پھر اچانک ہی آگئی ہو، موراں تو کہہ رہی تھی ہفتے دو ہفتے رہو گی۔'' سنہری نے اس کا پاندان کھول کر اس میں سے چھالیا اور میٹھی سونف نکال کر ہتھیلی پر رکھی اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر پھر پوچھا۔'' ویسے اماں یہ اچانک لاہور کیوں چلی گئی تھیں۔ کیا وہاں کی صورتِ حال دیکھنے گئی تھیں۔ بالکل پولیس کی طرح چھاپا مارا تم نے...... ویسے وہاں سب ٹھیک تو تھے ناں رادھا...... ریکھا، شمو......''
''توبہ ہے سنہری، بریک تو لے ذرا...... سوال پر سوال کرتی چلی جارہی ہے۔''
''تو تم باری، باری سب کا جواب دے دو ناں...... ویسے کیا ہم واپس لاہور جارہے ہیں۔''
''کیا خبر جانا ہی پڑے۔'' شاہجہان بڑبڑائی لیکن سنہری نے اس کی بڑبڑاہٹ نہیں سنی۔ وہ بہت دھیان سے ہتھیلی پر رکھی چھالیا اور سونف میں سے سونف کے دانے اٹھا، اٹھا کر منہ میں ڈال رہی تھی۔
''میرے بعد کوئی آیا تو نہیں تھا؟'' شاہجہان کو یک دم ہی پوچھنے کا خیال آیا تھا۔
''کس نے آنا تھا اماں؟'' سنہری نے جواب دے کر باقی ماندہ ساری سونف اور چھالیا اکٹھی منہ میں ڈال لی تھی۔
''رستے بستے گھروں میں کوئی نہ کوئی آہی جاتا ہے۔ اس لیے پوچھا ہے۔''
''رستا بستا گھر......'' شاہجہان کی بات سن کر سنہری ہنس پڑی۔ عجیب تمسخر اڑاتی سی ہنسی تھی۔
''کیا ہمارے جیسوں کے بھی ''گھر'' ہوتے ہیں اماں...... گھر تو شریف کہلوانے والوں کے ہوتے ہیں۔''
''توبہ ہے سنہری تم سے تو کوئی بات کرنا محال ہے، بال کی کھال نکالتی ہو۔'' شاہجہان بلاوجہ جھنجلائی۔ اس کے ذہن میں وسوسہ کا خیال آیا تھا جو اس کا پتا لیتا پھر رہا تھا۔'' جانے اتنے سالوں بعد کیا ہڑک اٹھی ہے اسے۔''
''کس نے آنا تھا اماں......؟'' سنہری بھی سنجیدہ ہوگئی۔
''ایک صاحبزادہ صاحب ہی تھے جنہیں ہر دوسرے تیسرے دن موتیا کی ہوک اٹھتی تھی اور ڈرائیور بھجواتے

تھے یا خود لینے چلے آتے تھے لیکن اب جب سے موتیا کو چھوڑ کر گئے ہیں ایک بار بھی جھانک کر نہیں دیکھا..... لگتا ہے چاؤ اتر گیا ہے..... ویسے کس نے آنا تھا اماں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے شاہجہان کی طرف دیکھا لیکن وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''کیا سوچنے لگی ہو اماں کس نے آنا تھا آخر.....؟'' اس نے اپنی بات دُہرائی تو شاہجہان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کسی نے نہیں بس یونہی پوچھ لیا۔''

''اچھا.....'' سنہری نے آنکھیں مٹکائیں۔

''تم نے تو یونہی پوچھ لیا..... پر یاد آیا ایک بندہ آیا تو تھا۔''

''کون تھا؟ کیا نام بتایا تھا؟'' شاہجہان متجسس ہوئی۔

''وہی جس کا تمہیں انتظار تھا۔'' سنہری کو بھی چوہے بلی کا کھیل کھیلنے میں مزہ آتا تھا۔

''کس کا انتظار تھا مجھے؟'' شاہجہان جھنجلائی۔

''سجو کے باپ کا اور کس کا.....؟'' سنہری اٹھلائی اور شاہجہان کا دل دھک سے رہ گیا۔

''تجھے الہام ہوا ہے کیا؟''

''اب جو بھی تم سمجھو لیکن کیا غلط کہا ہے میں نے؟''

''سنہری.....'' شاہجہان نے اسے گھورا۔ ''تیری یہ فضول بک بک کی عادت زہر لگتی ہے مجھے اور یہ پہلیاں نہ بجھوا سیدھی طرح بتا کون آیا تھا؟''

''وہی تو آیا تھا، بابر نوید نام بتایا تھا اس نے۔'' سنہری نے شاہجہان کے تاثرات دیکھنے کے لیے ہنوز اسے دیکھا۔

''چل دفع کر اسے۔'' شاہجہان نے ہاتھ سے مکھی اڑائی۔ ''وہ کیوں ہونے لگا سجو کا باپ جھوٹا، فراڈیا، مکار۔''

''تو وہ نہیں تھا سجو کا باپ؟'' سنہری کا چہرہ اتر گیا اور آواز سے مایوسی جھلکنے لگی۔

''اتنا امیر لگتا تھا..... یہ بڑی سی گاڑی تھی، کہہ رہا تھا کہ بیس اکیس برسوں بعد شاہجہان سے ملنے آیا ہوں ایک کام ہے۔'' سنہری کی آواز مدھم پڑ گئی تھی جیسے خود کلامی کر رہی ہو۔

''میں نے سوچا تھا اپنی سجو عیش کرے گی بیگم صاحبہ بن کر رہے گی۔ گاڑیوں میں گھومے گی، کسی امیر آدمی سے اس کی شادی ہو جائے گی۔ معتبر ہو جائے گی اور کیا خبر اس کے طفیل ہمیں بھی عزت مل جائے۔''

''خواب کم دیکھا کر سنہری.....'' شاہجہان نے تاسف سے اسے دیکھا۔

''اپنی قسمت میں تو بس خواب دیکھنا ہی لکھا ہے اماں۔'' سنہری کی چمکتی آنکھیں بجھ سی گئیں۔

''اچھا چل.....'' شاہجہان کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ موراں نے چائے کے دو کپ آ کر تپائی پر رکھے اور سنہری کی طرف دیکھا۔

''یہ اس سنہری کو کیا ہوا ہے۔ شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟''

''لو مجھے کیا ہونا ہے۔'' سنہری نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

''ذرا اوپر جا کر دیکھ آ موتیا جاگ گئی ہے یا نہیں.....'' شاہجہاں نے کہا۔

''ارے ہاں دیکھتی ہوں کب سے سو رہی ہے کہیں بخار پھر تو نہیں ہو گیا۔'' موراں سیڑھیوں کی طرف

بڑھ گئی۔

''موتیا بہت کمزور ہوگئی ہے۔ کچھ کھاتی پیتی ہی نہیں ہے۔ اب تم آئی ہو تو سمجھانا... ہماری تو کچھ سنتی ہی نہیں ہے۔'' سنہری نے شاہجہان کو بتایا۔

''ویسے اماں......'' وہ تھوڑا سا اس کی طرف جھکی۔ ''یہ ہماری موتیا کہیں عشق کا روگ تو نہیں لگا بیٹھی مجھے تو لگتا ہے صاحبزادہ صاحب سے دل لگا بیٹھی ہے۔ ایسی پیلی ہو رہی ہے۔'' سنہری زیادہ دیر تک خود پر ایک ہی موڈ طاری نہیں رکھتی تھی۔

''چل ہٹ پرے......'' شاہجہان نے اسے ہاتھوں سے پیچھے کیا۔ ''جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہے، موتیا اتنی کچی نہیں ہے تو ہوتی تو ضرور کوئی روگ لگا لیتی۔''

''ہائے کاش کوئی روگ لگ ہی جاتا مجھے۔'' سنہری کی آنکھیں پھر شرارت سے چمکنے لگی تھیں۔

''مجھے اور موتیا کو تو نہ لگا یہ روگ...... پر تیری شہزادی بجو کو جسے تو سات پردوں میں چھپا، چھپا کر رکھتی تھی۔ لگ گیا یہ روگ......''

''کیا بک رہی ہے؟'' شاہجہان بیگم اسے ہونقوں کی طرح تکنے لگی۔

''کیا صاحبزادہ صاحب؟'' اس کے حلق میں... جیسے گولا سا پھنس گیا اور اس نے کپ میں بچی ہوئی چائے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اتاری۔

''صاحبزادہ صاحب؟'' سنہری کے حلق سے قہقہہ برآمد ہوا۔ ''لگتا ہے اماں آج تو اپنے حواس میں نہیں ہے۔ بھلا کہاں صاحبزادہ صاحب اور کہاں ہماری بجو...... اب بجو کی نظر اتنی بھی کمزور نہیں۔''

سچ ہی تو کہہ رہی تھی سنہری وہ آج حواسوں میں نہیں تھی۔ ایک طرف صاحبزادہ صاحب کے مطالبے نے اس کا دماغ گھما رکھا تھا۔ دوسری طرف یہ بابر کمبخت پتا نہیں کیوں اسے کھوجتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا تھا۔

''خیر میری جوتی کو بھی پروا نہیں اس کی۔ کہہ دوں گی جو بھی اس وقت ذہن میں آیا...... ایک تو خواہ مخواہ کی مصیبت ڈال دی سر پر اور اب باز پرس کرنے آ رہا ہے...... ارے بھئی ہمیں کیا پتا بھاگ گیا ہوگا کہیں۔''

''تجھے بتایا تو تھا اماں وہ پروفیسر کے بیٹے کا دوست...... اپنے باپ کو بھیجنا چاہتا ہے بجو کے رشتے کے لیے اور تم تو پوری بات سنے بغیر لاہور بھاگ لیں۔''

''ہاں بتایا تو تھا پھر......؟'' شاہجہان نے پُرسوچ انداز میں سنہری کی طرف دیکھا۔

''پھر کیا اماں اپنی بجو بھی اس سے شادی کرنا چاہتی ہے، بلوا لے ناں اس کے باپ کو۔'' سنہری نے شاہجہان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تجھے کیا لگتا ہے سنہری، وہ نبھانے والا ہے یا بیچ راہ میں چھوڑ دے گا۔'' شاہجہان نے پوچھا۔

''قسم سے اماں چھوڑنے والا نہیں قول کا پکا لگتا ہے۔''

''اچھا تو پھر بجو کو بول، اسے کہہ دے، اپنے باپ کو لے کر کل ہی آ جائے۔'' شاہجہان کو صاحبزادہ صاحب سے بچنے اور اپنا قول نبھانے کے لیے یہی راستہ نظر آیا تھا۔ بادلِ ناخواستہ ہی سہی سر پر یہ جو صاحبزادہ صاحب کی تلوار لٹک رہی ہے اس نے بجل کو رخصت کرنے کا سوچ لیا تھا...... ''اب جیسا بھی ہوا، بھوکا، ننگا، شریف تو ہے ناں...... بجو کا گھر بھی بس جائے گا...... بقول ظہورے کے ہمارے کام کی تو رہی نہیں چار حرف پڑھ کر...... اور وعدہ بھی پورا ہو جائے گا۔ کبھی جو زندگی میں اس سے سامنا ہوا تو کہہ سکوں گی تم نے جو کوٹھے والی پر اعتبار کیا تھا تو اس نے بھی تیرے اعتبار کی لاج رکھ لی۔''

''اور وہ جو نجل کو بڑی اداکارہ بنانے کا خواب دیکھا تھا اس نے۔'' دل میں جیسے کسی نے چٹکی بھری تھی۔'' یہ سنہری ہے ناں پوری اداکارہ۔'' اس نے خود کو تسلی دے کر سنہری کی طرف دیکھا۔ جس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور رخساروں پر لالی تھی۔

''سچ اماں......!'' اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر سنہری نے یک دم ہی اس کے رخساروں پر دائیں بائیں باری، باری بوسہ دیا اور خوشی سے گنگناتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔

''راجا کی آئے گی بارات، رنگیلی ہوگی رات مگن میں ناچوں گی۔''

اس نے دونوں ہاتھ فضا میں پھیلائے اور ایڑیوں پر گول، گول گھومتے ہوئے کھلکھلا... کر ہنسی......اور اتنے دنوں کی ٹینشن کے بعد شاہجہان کو اطمینان سا محسوس ہوا اور وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''دیکھوں تو یہ موراں اوپر ہی جا کر مر گئی کہیں موتیا کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو۔'' سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے سنہری کی طرف دیکھا جو اسی طرح ہاتھ پھیلائے گول، گول گھوم رہی تھی۔

''پارہ بھرا ہے کمبخت کے بدن میں۔'' شاہجہان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

☆☆☆

''باس!'' ممتاز خان نے لاؤنج میں جھانکتے ہوئے ثمر حیات کو مخاطب کیا تو ثمر حیات نے جو نہ جانے کس سوچ میں گم تھا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے ممتاز خان؟''

''مجھے دو تین گھنٹے کے لیے چھٹی چاہیے تھی باس...... اُدھر ناظم آباد میں ایک عزیز کی مزاج پرسی کے لیے جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے چلے جاؤ لیکن جاتے ہوئے عظام کو ذرا میرے پاس بھیج دینا۔ شاید باہر لان میں ہوگا۔''

''لیکن عظام صاحب تو کہیں باہر چلے گئے ہیں۔''

''کہاں... کچھ بتا کر گیا ہے؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے ممتاز خان کی طرف دیکھا۔

''نہیں کچھ نہیں بتایا...... چھوٹی گاڑی لے کر گئے ہیں۔'' ممتاز خان نے بتایا۔

''آخر کہاں گیا ہے، مجھے بھی بتا کر نہیں گیا۔'' اس نے جیسے خود کلامی کی۔

''وہ آپ کے بیڈ روم کی طرف جا تو رہے تھے۔ میں کچن میں آیا تھا پانی لینے تو دیکھا تھا لیکن شاید آپ آرام کر رہے تھے ڈسٹرب نہیں کیا۔'' ممتاز خان نے خیال ظاہر کیا۔

''گارڈ ساتھ لے کر گیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، میں نے کہا بھی تھا لیکن انہوں نے منع کر دیا۔''

''ہوں، ٹھیک ہے تم جاؤ......'' ممتاز خان کی بات سن کر ثمر حیات نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

''دونوں گارڈ باہر ہی ہیں، میں نے انہیں گیٹ کا خیال رکھنے کو کہہ دیا ہے۔'' ممتاز خان نے بتایا تو ثمر حیات نے سر ہلا دیا۔ وہ یک دم ہی پریشان سا ہو گیا تھا کہ کتنی ہی بار اس نے عظام سے کہا تھا کہ کہیں بھی جانا ہو اکیلے مت جاؤ کم از کم ایک گارڈ کو ساتھ لے جایا کرو...... پتا نہیں سائیں مٹھا کے آدمی کہاں گھات لگا کر بیٹھے ہوں اور میرے پاس عظام کے سوا اور ہے ہی کیا......'' جب سے اس کی سائیں مٹھا سے ملاقات ہوئی تھی وہ عظام کے لیے یوں ہی پریشان رہتا تھا۔ اگر رواحہ کا حادثہ نہ ہوتا تو وہ اب تک عظام کے لیے کوئی نہ کوئی فیصلہ کر چکا ہوتا۔ وہ عظام کے لیے

خوفزدہ تھا گو ابھی اس کا خوف بے معنی تھا۔ کیونکہ سائیں مٹھا نہیں جانتا تھا کہ عظام کون ہے۔ اس نے عظام کو اسی خوف سے اب تک ہاسٹل میں رکھا تھا کہ سائیں مٹھا کو اس کے متعلق علم نہ ہو...... لیکن سائیں مٹھا نے اگر کبھی اس کے ٹھکانے کا پتا چلا لیا تو اس کے لیے یہ جان لینا کون سا مشکل ہوگا کہ عظام اس کا بیٹا ہے اور پھر...... ایک بار اس نے اسے اس کے خاندان سمیت ختم کرنے کی کوشش کی تھی پھر اب دوبارہ بھی تو وہ...... اس نے ایک جھرجھری سی لے کر سر جھٹکا۔

''میں یونہی پریشان ہو جاتا ہوں...... اب ایسا بھی کیا ہے کہ ایک ایم پی اے کے پاس مجھ پر نظر رکھنے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں ہو۔'' اس نے خود کو تسلی دی اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا...... اسے ٹی وی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، نہ ہی ڈراموں سے، نہ ٹاک شوز سے، نہ خبروں سے۔ بلکہ اس کے پاس وقت ہی کہاں ہوتا تھا ٹی وی دیکھنے یا اخبار پڑھنے کے لیے لیکن اس وقت وہ فارغ تھا اور اسے جلیل خان کے فون کا انتظار تھا اور... وقت گزاری کے لیے اس نے ٹی وی آن کر لیا تھا۔ اسے جلیل خان سے حتمی بات کرنا تھی اور وہ رات سے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کا فون بند تھا۔ وہ دو دن قبل ہی لندن سے آیا تھا اور رواحہ کی وجہ سے ملنے نہیں جا سکا تھا اور نہ ہی اس نے فون کر کے اسے بلایا تھا۔ غالباً بالی اور سیمو سے اسے عظام کے دوست کے حادثے کی خبر مل گئی ہوگی...... لیکن اب جب وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا تو جلیل خان نے فون آف کر رکھا تھا۔ وہ اس زندگی کو خیرباد کہنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اسے جلیل خان سے حتمی بات کرنا تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ عظام کے پروپوزل کے فائنل پیپرز کے بعد وہ خانیوال منتقل ہو جائے گا اور عظام ہاسٹل میں رہ کر پنجاب یونیورسٹی سے اپنا ماسٹر مکمل کر لے گا۔ مائیگریشن کا یقیناً کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوگا۔ آج سنڈے کی وجہ سے عظام دیر سے اٹھا تھا۔ اسے بھی رات دیر سے ہی نیند آئی تھی۔ وہ لوگ رواحہ کے گھر سے تقریباً بارہ بجے آئے تھے۔ رواحہ کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ اور وہ عظام کے ساتھ رواحہ کو دیکھنے گھر گیا تھا اور رواحہ کے والد نے انہیں روک لیا تھا۔ وہاں بہت اچھا وقت گزرا تھا۔ رواحہ کے شوخ اور برجستہ جملے اس کے والد کا بے تکلفانہ اور دوستانہ انداز وہ بہت متاثر ہوا تھا۔ یہ ایک مکمل گھر تھا اور بہت پُرسکون اور خوشگوار ماحول تھا۔ وہ عظام کو یہ سب نہیں دے سکا تھا۔ شاید اسی وجہ سے رواحہ کے مقابلے میں عظام کچھ سنجیدہ سا تھا...... گھر آ کر بھی وہ کتنی ہی دیر تک عظام اور رواحہ کا موازنہ کرتا رہا تھا۔ رواحہ کی شوخی اور شرارت اسے اچھی لگ رہی تھی۔ ظفری کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد رواحہ کے والد بھی خوش اور مطمئن تھے اور رواحہ کے ساتھ ان کی چھیڑ چھاڑ جاری تھی۔ اس نے خود کو ٹٹولا تو اس کے اندر یہ زندگی مفقود تھی جو اس گھر کی فضا میں نظر آ رہی تھی۔ تب بے اختیار ہی وہ ان سے کہہ بیٹھا تھا۔

''پروفیسر صاحب، چلیں اپنے اصل کی طرف لوٹ چلیں۔ یہ شہر کراچی اگرچہ اپنے دامن میں بہت وسعت رکھتا ہے لیکن اتنے سال یہاں رہنے کے باوجود کبھی، کبھی اجنبی لگنے لگتا ہے۔ لاہور کے گلی کوچے بے طرح یاد آتے ہیں۔'' خدا بخش نے زور شور سے اس کی تائید کی تھی اور پروفیسر صاحب نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''چلیے تو جائیں ثمر حیات صاحب لیکن یہاں ہمارے جگر گوشے کے دل کے نازک معاملات......''

''بابا......!'' رواحہ نے انہیں گھورا تھا۔ اور ان کی بات سمجھ کر وہ ہنس دیا تھا۔

''اُدھر ہی نہیں اِدھر بھی کچھ نازک معاملات چل رہے ہیں...... لیکن انہیں سلجھانے کے بعد تو کچھ سوچا جا سکتا ہے ناں......؟''

''پاپا......'' اب کے عظام نے انہیں شاکی نظروں سے دیکھا تھا اور پھر وہ چاروں ہنس دیے تھے۔ اس طرح کے ایسے خالص گھریلو ماحول کو کتنے عرصے بعد وہ انجوائے کر رہا تھا۔ اتنا اچھا وقت گزار کر آنے کے باوجود بھی..

بہت بے کل اور بے چین تھا۔ اسے اماں، ابا اور اپنا پرانا گھر یاد آرہا تھا۔ سو رات بھر سو نہیں پایا تھا۔ اس لیے ناشتا کرتے ہی وہ اٹھ کر اپنے بیڈروم میں کچھ دیر آرام کرنے کے لیے آگیا تھا۔ شاید اس لیے عظام نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا تھا اور بغیر بتائے چلا گیا تھا۔ رواحہ کی طرف سے تو وہ رات کو ہی آئے تھے...... ہوسکتا ہے جواد کی طرف ہاسٹل چلا گیا ہو...... اس نے پاس پڑا فون اٹھا کر عظام کا نمبر ملایا۔

''کہاں ہو یار؟ بتا کر بھی نہیں گئے۔''

''بس پاپا ایک دوست کی کال آگئی تھی، اسی کی طرف جارہا ہوں۔''

''کون دوست......؟''

''پاپا وہ......'' وہ جھجکا۔'' آکر بات کرتا ہوں۔''

''کوچۂ جاناں کی طرف تو نہیں جارہے؟'' وہ عظام سے اتنا بے تکلف تو نہیں تھا لیکن بے اختیار لبوں سے نکل گیا۔ شاید یہ رات رواحہ کے گھر کی پُرلطف محفل کا اثر تھا۔

''پاپا......'' دوسری طرف عظام جھینپ گیا۔

''اوکے بچل بیٹی کو میرا پیار کہنا...... اور ہاں کب ملوا رہے ہو مجھے اس سے؟''

''اس سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ ویسے اس کی والدہ واپس آگئی ہیں۔''

''اوکے گڈ لک......!'' اس نے فون آف کر کے پاس ہی صوفے پر رکھا اور ریموٹ اٹھا کر چینل چینج کیا...... عجیب فضول سا پروگرام آرہا تھا۔ اب ایک نیوز چینل تھا اور بریکنگ نیوز آرہی تھی۔

''صوبائی اسمبلی کے ممبر سکندر سومرو جو کل رات گاڑی کے حادثے میں شدید زخمی ہوگئے تھے، آج صبح اسپتال میں زندگی کی بازی ہار گئے۔ مرحوم کا تعلق ملتان سے تھا۔ اور وہ سائیں مٹھا کے نام سے معروف تھے۔ آپ کو یہ بتاتے چلیں کہ کل رات ملتان سے لاہور آتے ہوئے ان کی گاڑی مخالف سمت سے آنے والے ایک ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔ اور ان کی بیوی، بیٹا اور ڈرائیور موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے تھے۔ جبکہ سائیں مٹھا کو شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔'' وہ شاکڈ سا ٹی وی کی اسکرین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں اب اس کی گاڑی دکھائی جارہی تھی۔

''اناللہ وانا الیہ راجعون۔'' اس کے لبوں سے نکلا...... اس نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا...... کتنا صبر کیا تھا اس نے کیسے، کیسے روکا تھا خود کو، سمجھایا تھا جب اذیت حد سے بڑھتی تو جی چاہتا تھا کہ ریوالور اٹھا کر جائے اور ساری گولیاں اس کے سینے میں اتار دے جو اس کی فرحی کا قاتل تھا اور جو...... لیکن پھر اس کے قدموں میں زنجیریں پڑ جاتیں۔ فرحی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا اور اس کی وہ ٹوٹی بکھری سی آواز کانوں میں گونجتی۔

''وعدہ کرو ثمر، تم میرا انتقام نہیں لو گے۔ تم نے زندہ رہنا ہے...... اپنے اور روحان کے لیے...... تمہیں کچھ ہوگیا تو میرا روحان اکیلا رہ جائے گا۔''

''اور روحان......'' اس نے اپنا نچلا ہونٹ سختی سے دانتوں تلے داب لیا۔

''تو مٹھا سائیں مرنے سے پہلے یقیناً تم نے بھی اس اذیت کو محسوس کیا ہوگا جو اپنے خاندان کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھ کر ہوتی ہے۔ وہ تمہارا اکلوتا بیٹا تھا شاید...... اور تمہاری بیوی...... تمہیں مرنے سے پہلے پتا تو چل گیا ہوگا......'' نیوز کاسٹر بتا رہا تھا کہ سکندر سومرو نے خود گاڑی سے اُن کی ڈیڈ باڈیز نکالی تھیں۔ اسے اپنے سینے سے ایک بوجھ سا سرکتا ہوا محسوس ہوا۔ کتنے برسوں سے یہ بوجھ سینے پر دھرا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں میں نمی سی پھیلتی محسوس ہوئی تھی۔ کتنے سالوں سے اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اس نے اپنے

سارے آنسو منجمد کر کے اپنے اندر اتار لیے تھے اور اندر ان آنسوؤں سے آگ دہکتی تھی لیکن آج ان خشک آنکھوں میں نمی تھی اور آنسو باہر آنے کو بے تاب تھے۔

ٹی وی اسکرین پر دوبارہ وہی خبر...... دُہرائی جارہی تھی...... خبر سنانے والے کا وہی سپاٹ سا انداز جیسے وہ کسی کی موت کی خبر نہ سنا رہا ہو کوئی سنسنی خیز روزنامچہ پڑھ رہا ہو...... اس نے ٹی وی آف کر دیا...... اس کی آنکھوں کے سامنے فرحی اور روحان کے چہرے آرہے تھے۔ شدتِ کرب سے اس نے آنکھیں موندتے ہوئے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی...... اور ماضی کے کئی مناظر آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔

اس رات جب اس کا سائیں مٹھا اور اس کے بندوں سے ٹکراؤ ہوا تھا، اسی رات گھر واپس آنے پر اسے جلیل خان کی رہائی کی خوشخبری ملی تھی۔ صبح دس بجے اسے لینے جانا تھا اور اس نے اسی وقت فرحی کو فون کیا تھا۔

''فرحی ہماری سزا ختم ہوگئی ہے۔ خان بابا رہا ہو رہے ہیں...... اور میں دو تین روز تک واپس خانیوال آرہا ہوں۔ ہمیشہ کے لیے......''

فرحی بہت خوش ہوئی تھی۔

''اب ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے ثمر جس میں ماضی کا کوئی حوالہ نہیں ہوگا...... میں، تم، روحان، خان بابا اور زیتون خالہ...... ہم ایک مکمل خاندان اور سادہ سی زندگی......'' فرحی جذباتی ہو رہی تھی۔

وہ پوری رات اس نے آنے والی زندگی کا خواب دیکھتے گزاری تھی۔ وہ سائیں مٹھا اور اس کے بندوں سے ہونے والی لڑائی بھول گیا تھا۔ صبح وہ بہت جلدی اٹھا تھا اور دس بجے سے بہت پہلے جیل پہنچ گیا تھا۔ جلیل خان ٹھیک دس بجے باہر آیا تھا۔ گھر آنے کے فوراً بعد ناشتا کرتے ہوئے اس نے جلیل خان کو بتایا تھا۔ '' فرحی نے خانیوال میں اسٹور کے لیے جگہ پسند کر رکھی ہے۔ یہ ایک اڑھائی مرلے کا ڈبل اسٹوری گھر ہے جسے ہم کچھ تبدیلیوں کے بعد اسٹور میں بدل دیں گے۔ ایک پورشن آپ سنبھالیں گے اور ایک میں...... فرحی نے ساری پلاننگ کر لی ہے۔''

''آہ...... اب جلیل خان دکانداری کرے گا۔'' اس نے قہقہہ لگایا تھا۔ ''لگتا ہے ایک قید سے رہا ہو کر دوسرے قید خانے میں چلا جاؤں گا...... یہ فرحی بیٹی نے بھی کس مصیبت میں ڈال دیا ہے...... بالکل اور طرح کا بندہ ہوں میں یار...... ایسا نہیں ہوسکتا فرحی مجھے ان کانٹوں میں نہ گھسیٹے...... پتا نہیں یہ شریفانہ زندگی مجھے راس بھی آئے یا نہیں۔''

''آپ نے فرحی سے وعدہ کیا ہے خان بابا......'' وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ ''اور ابتدا میں ہر پتا کام مشکل لگتا ہے لیکن پھر سب کچھ آسان ہوتا چلا جاتا ہے۔''

''کہتا تو، تو ٹھیک ہے شہزادے...... ہولے، ہولے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ فرحی بیٹی نے خوب جکڑا وعدے کی زنجیروں میں...... جلیل خان نے کبھی ماں کے آنسوؤں کی پروا نہیں کی تھی لیکن یہ جو بیٹیاں ہوتی ہیں ناں سیدھا دل پر ہاتھ رکھتی ہیں۔ دل کو اپنی مٹھی میں یوں لیتی ہیں کہ بندہ سانس بھی نہیں لے پاتا۔'' وہ پھر ہنسا تھا۔

''خیر اس زندگی کا بھی مزہ چکھتے ہیں۔ میری ماں بھی بہت لالچ دیتی تھی مجھے...... اچھے کام کر کے ثواب کمانے کا تم دو تین روز میں چلے جانا، مجھے تو دس پندرہ دن لگ جائیں گے یا کچھ زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ سب کچھ سیٹل کرنے میں...... شیر خان ہے، گلا بابا ہے اور کئی دوسرے ان سب کو بھی تو کنارے لگانا ہے۔ سارے معاملات کلیئر کرنے ہیں اور وہ بگل خان سے ڈیل ہوگئی تھی؟''

''ہاں خان بابا وہ تو سب کام ہو گیا تھا۔'' اس نے بتایا تھا۔

''اور شاہجہان بیگم وہ ابھی تک وحدت روڈ والے گھر میں ہے یا واپس اپنے ٹھکانے پر چلی گئی؟'' جلیل خان

نے پوچھا تھا۔

’’نہیں، وہ تو کہہ رہی تھی واپس جانے کو لیکن رات جب میں اور شیر خان، بسمل خان سے مل کر واپس آرہے تھے تو سائیں مٹھا سے ٹاکرا ہو گیا تھا۔‘‘ اس نے تفصیل بتائی تو جلیل خان پریشان سا ہو گیا تھا۔

’’یہ اچھا نہیں ہوا ثمر حیات تمہیں اس سے پنگا نہیں لینا چاہیے تھا۔ اب جبکہ تم نے اس زندگی کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو تمہیں خود کو ان جھمیلوں سے دور ہی رکھنا چاہیے۔‘‘ جلیل خان نے نصیحت کی تھی۔

’’وہ خود میرے راستے میں آیا تھا خان بابا.....‘‘ ان دنوں وہ بھی فرحی کی طرح اسے خان بابا کہنے لگا تھا۔

’’شریف آدمی راستے میں آنے والوں کے ہاتھ نہیں توڑتے، وہ کترا کر گزر جاتے ہیں یا راستہ بدل لیتے ہیں خیر‘‘ وہ ہولے سے ہنسا تھا۔

’’اب جو ہوا سو ہوا..... لیکن یہ لوگ ہیں بہت کینہ پرور..... میں ذاتی طور پر اس سائیں مٹھا کو تو نہیں جانتا لیکن اس کے باپ اور اس کے گرگوں سے واسطہ پڑ چکا ہے میرا..... جس سے ایک بار دشمنی ہو جائے قبر تک پیچھا کرتے ہیں اس کا..... خیر میں ذرا کچھ کام نمٹا لوں تو اس سے مل ملا کر معافی تلافی کر لیتے ہیں۔‘‘ اور جلیل خان کی بات پر بے حد حیران ہو کر اس نے اسے دیکھا تھا، وہ اس طرح کا آدمی نہیں تھا کہ لوگوں سے معافی تلافی کرتا پھرے..... وہ تو۔

’’میں بزدل نہیں ہوں حیاتے.....‘‘ اس نے اس کی حیرت بھانپ لی تھی۔ ’’میں تمہارے اور فرحی کے لیے ڈرتا ہوں میری بیٹی نے خواب بنے اور میں جیل چلا گیا اور اب پھر..... نہیں، بار اپنے فائدے کے لیے تو لوگ گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں۔ ہم دو چار لفظ بول دیں گے تو ہمارا کیا بگڑ جائے گا۔ اس کی انا کی تسکین ہو جائے گی اور ہمیں بلاوجہ کی دشمنی سے نجات مل جائے گی۔‘‘

اور جلیل خان کا یہ روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ صحیح کہتا تھا بیٹیوں کی محبت بندے کو کمزور کر رہتی ہے۔ جھکا دیتی ہے۔ اس جیسا جی دار شخص فرحی کی خوشی کی خاطر معافی مانگنے کو تیار تھا۔ اس کے لیے خوفزدہ تھا..... ڈر رہا تھا اور اس کا ڈر بے معنی نہیں تھا لیکن تب وہ نہیں جانتا تھا..... وہ تو خوشی سے سرشار جیسے اڑتا ہوا خانیوال پہنچا تھا۔ جلیل خان چونکہ آتے ہی بے حد مصروف ہو گیا تھا اس لیے وہ اکیلا ہی خانیوال آیا تھا۔ خانیوال میں گزرے یہ چند دن اس کی زندگی کے چند خوشگوار دنوں میں سے تھے۔ ریحان کے بعد وہ پہلی بار کھل کر ہنسے تھے۔ گھنٹوں مستقبل کے پلان بنائے تھے۔ پرانے دنوں کو یاد کیا تھا جب وہ اور فرحی چپکے، چپکے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ اپنے گورنمنٹ کالج کے ساتھیوں کو یاد کیا تھا۔ اور سوچا تھا کہ جب وہ اپنی اس نئی زندگی میں سیٹ ہو جائیں گے تو پھر اپنے ان ساتھیوں کو ڈھونڈیں گے اور مل بیٹھ کر ماضی کو زندہ کریں گے..... انہوں نے اسٹور کے لیے پسند کی جانے والی جگہ کا ایڈوانس بھی دے دیا تھا..... اور خانیوال میں ہی گھر بنانے کے لیے ایک پلاٹ پسند کیا تھا..... جلیل خان بہت مصروف تھا وعدے کے باوجود فرحی سے ملنے نہیں آسکا تھا تب فرحی نے خود ہی لاہور جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔

’’خان بابا سے مل بھی لیں گے اور روحان کے لیے کچھ شاپنگ بھی کرلیں گے۔‘‘ فرحی نے اس سے کہا تھا اور وہ خوش، خوش جلیل خان سے ملنے لاہور آئے تھے۔ جلیل خان، فرحی اور روحان سے مل کر بہت خوش ہوا تھا۔ وہ جو صرف ایک دن کے لیے گئے تھے جلیل خان کے اصرار پر ایک دن مزید رک گئے تھے۔ فرحی نے اپنے ہاتھوں سے جلیل خان کے لیے مٹن پلاؤ پکایا تھا اور ساتھ فیرنی بنائی تھی کیونکہ جلیل خان کو مٹن پلاؤ بہت پسند تھا، ایک بار اس نے بتایا تھا کہ اس کی ماں اس کے لیے کبھی، کبھی مٹن پلاؤ پکاتی تھی جو اسے بہت پسند تھا اور اس کے لیے مٹی کی ٹھوٹیوں (کٹوری) میں فیرنی ٹھنڈا کرنے کے لیے ڈال کر رکھتی تھی۔ وہ تھوڑے، تھوڑے پیسے بچاتی رہتی تھی اور جب

چاول اور گوشت خریدنے کے لیے پیسے جمع ہو جاتے تو پلاؤ پکاتی تھی...... وہ خود نہیں کھاتی تھی مجھے کھاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتی اور ساتھ ہولے، ہولے دھیمے لہجے میں نصیحت بھی کرتی رہتی تھی۔

''پلاؤ کا لالچ دے کر وہ کڑی نصیحتیں کرتی تھی۔'' اس نے قہقہہ لگایا تھا وہ یونہی اپنی ماں کی یادوں کو قہقہوں میں بھلانے کی کوشش کرتا تھا۔

میز انواع واقسام کے کھانوں سے بھری ہوئی تھی لیکن اس نے صرف پلاؤ کھایا تھا۔

''بھئی میں تو صرف اپنی بیٹی کے ہاتھ کا پکا ہوا پلاؤ ہی کھاؤں گا۔''

یہ بہت یادگار دن تھا۔ جلیل خان نے اس روز اپنے ماضی کی بہت سی یادیں ان کے ساتھ شیئر کی تھیں۔ کھانے کے بعد وہ تو کچھ لوگوں سے ملنے چلا گیا تھا اور وہ روحان کو چڑیا گھر دکھانے کے لیے لے گئے تھے۔ پھر انہوں نے شاپنگ کی تھی۔ روحان کے لیے فرحی نے کئی قسم کے بلاکس خریدے تھے...... وہ خوب گھومے پھرے تھے کئی بار فرحی کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے اور کئی بار اس کا جی رونے کو چاہا تھا۔ یہ وہ شہر تھا جہاں انہوں نے آنکھ کھولی تھی۔ پلے بڑھے تھے۔ اس شہر کی کوئی گلی ان کے لیے انجان نہ تھی اور اسی شہر میں ان کا سب کچھ چھن گیا تھا، وہ لوگ اجنبی اور پرائے ہو گئے تھے جو کبھی اُن کے اپنے تھے۔ سارے شہر نے جیسے پتھر اٹھا لیے تھے...... وہ ان سارے جانے پہچانے راستوں پر روحان کے ساتھ گھومتے پھرے۔ وہ فرحی کو بانو بازار کی چاٹ کھلانے بھی لے گیا تھا اور انہوں نے اردو بازار سے ڈھیر ساری کتابیں بھی خریدی تھیں۔ مال روڈ پر فیروز سنز کے پاس سے بھی گزرے تھے اور گورنمنٹ کالج کو بھی دور سے دیکھا تھا۔ اور وہ بنا فرحی کے کچھ کہے فرحی کو اس کے گھر کے باہر بھی لے گیا تھا۔ وہ گھر جہاں اس کے ماں، باپ اب نہیں تھے۔ بھائی بھابی رہتے تھے۔ وہ گھر اسی شان وشوکت سے کھڑا تھا۔ اور اس کے ماتھے پر آج بھی حامد ولا کی نیم پلیٹ دھوپ میں چمک رہی تھی۔ زندگی میں کتنی تبدیلیاں آ گئی تھیں لیکن اس کا گولڈن رنگ اسی طرح دمک رہا تھا۔ فرحی نے کتنی ہی دیر تک حسرت سے اسے دیکھا تھا...... برسوں پہلے اس گھر کے دروازے اس کے لیے بند ہو گئے تھے۔ اس کا کتنا جی چاہا تھا کہ وہ گیٹ کھول کر جھانک کر دیکھے...... کیا لان میں اب بھی اس کا پسندیدہ جھولا تھا لیکن دل پر پتھر رکھے وہ وہاں سے پلٹ آئے خانیوال جانے کے بعد وہ صرف تین بار یہاں آئی تھی۔ جلیل خان سے ملنے پھر ریحان کا چیک اپ کروانے اور اب تیسری بار پھر جلیل خان سے ہی ملنے آئی تھی۔ وہ اس شہر میں آتے ہوئے لہولہان ہو جاتی۔ سارے زخموں کے ٹانکے کھل جاتے تھے۔

اس لیے تو اس نے ریحان کے علاج کے لیے راولپنڈی جانا پسند کیا تھا...... وہ اس شہر سے خوفزدہ تھی۔ کیا خبر کوئی جاننے والا مل جائے کوئی پہچان جائے اور اب بھی وہ جلیل خان سے ملنے آئی تھی۔ اسے پھر کبھی اس شہر میں نہیں آنا تھا۔ اور وہ نہیں جانتی تھی کہ واقعی وہ پھر کبھی اس شہر میں نہیں آئے گی۔ اسے یہاں سے ہی واپس چلے جانا تھا لیکن پھر ثمر حیات کے کہنے پر وہ روحان کو چڑیا گھر دکھانے اور شاپنگ کے لیے نکلے تھے اور پھر جیسے راستے اور گلیاں انہیں پکارنے لگی تھیں۔ اور وہ ان گلیوں، راہوں اور شاہراہوں پر ایک خواب کے سے عالم میں گھومتے پھرے تھے۔ اور جب مغرب کے بہت بعد وہ تھکے ہارے گھر پہنچے تو ایک نامعلوم سی اداسی نے انہیں لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ فرحی اسی وقت واپس جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ جلیل خان نے منع کیا اور اصرار بھی کیا تھا کہ وہ رات کو رک جائیں لیکن فرحی کو یک دم گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

''نہیں ثمر ابھی چلتے ہیں...... مجھے پتا نہیں کیوں لگ رہا ہے کہ ہم یہاں رک گئے تو یہ گھر ہمیں باندھ لے گا...... ہم یہاں سے نہیں جا سکیں گے۔ کبھی اس دلدل سے نکل نہیں پائیں گے۔''

اور ثمر حیات کا اپنا دل بھی بے حد بوجھل تھا۔ وہ خود اپنے دل کی کیفیت نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا

تھا جیسے کوئی دل میں بار، بار سوئیاں چبھوتا ہو...... عجیب سی بے کلی اور بے چینی تھی...... اور یوں جلیل خان کے روکنے کے باوجود وہ رات نو بجے کے قریب خانیوال کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ جلیل خان نے زبردستی شیر خان کو ساتھ بھیجا تھا۔

''رات کا وقت ہے شیر خان کو ساتھ لے جاؤ...... مجھے بھی تسلی رہے گی۔ صبح واپس آجائے گا...... بلکہ تم تھکے ہوئے ہو بہتر ہے کہ اسے ہی ڈرائیو کرنے دو۔'' وہ منع کرنا چاہتا تھا لیکن پھر جلیل خان کی دل آزاری کے خیال سے خاموش ہو گیا تھا۔ یوں بھی دن بھر کی تھکن اور اس نامعلوم اداسی اور بے کلی نے اسے نڈھال کر رکھا تھا سو وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور گاڑی کی چابی شیر خان کے حوالے کر دی تھی۔ پچھلی سیٹ پر فرحی اور زیتون بانو تھیں۔ روحان بھی تھک کر زیتون بانو کی گود میں سو رہا تھا۔

وہ جب مین روڈ پر آئے تو انہیں خبر بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک گاڑی پچھلے موڑ سے نکل کر اُن کی گاڑی کے پیچھے لگ گئی تھی۔ وہ ایک ویران سڑک تھی اور رات کے اس پہر اس پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ دونوں اطراف گھنے درخت تھے جن کے سائے اندھیرے میں بڑے خوفناک لگ رہے تھے۔ وہ آنکھیں موندے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے ہوئے تھا جب شیر خان نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دی تھیں۔

''کیا بات ہے شیر خان؟''

''مجھے شک ہے ایک گاڑی لاہور سے ہمارے پیچھے لگی ہے۔ ایک بار اس نے ہمیں اوورٹیک بھی کیا اور پھر آگے جا کر اس نے رفتار آہستہ کر لی اب ایک بار پھر وہ ہمیں اوورٹیک کر کے آگے نکل گئی ہے۔ مجھے شک ہے کہ اس گاڑی کو میں نے شام کے وقت بھی دیکھا تھا جب آپ لوگ گھوم پھر کر واپس آئے تھے۔''

''تمہارا وہم بھی ہو سکتا ہے شیر خان۔'' اس نے شیر خان کی بات سن کر کہا تھا اور غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا...... پیچھے دور تک سڑک خالی تھی۔ سامنے بھی کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔

''کہیں یہ سائیں مٹھا کے بندے نہ ہوں'' شیر خان کے لہجے میں تشویش تھی۔

''ہم یا وہ کسی جاسوسی کہانی کے کردار نہیں ہیں یار کہ وہ ہمارا تعاقب کر رہے ہیں۔ کیا رات کے اس پہر وہ ہمارے انتظار میں تھے یا گھر کی نگرانی کر رہے تھے کہ ہمارے پیچھے چل پڑے۔'' وہ ہولے سے ہنسا تھا۔

''اتفاق بھی ہو سکتا ہے باس...... اتفاقاً دیکھا ہو اور پیچھے لگ گئے ہوں۔'' شیر خان کچھ مضطرب سا ہو گیا تھا۔ غیر ارادی طور پر ایکسی لیریٹر پر اس کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔

''اگر وہ پھر نظر آتی ہے تو میں اسے چیک کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''رہنے دو یار......'' اس نے پھر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی تھی۔ لیکن پھر شیر خان نے کچھ دیر بعد ہی اچانک بریک پر پاؤں رکھا تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ بالکل سامنے ہی سڑک پر وہ گاڑی ترچھی ہو کر کھڑی تھی...... ابھی وہ صورتِ حال سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ شیر خان نے دروازہ ان لاک کیا اور اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتا ونڈ اسکرین کو توڑتی ہوئی کئی گولیاں آکر سیدھی شیر خان کے سر اور بازو پر... لگی تھیں وہ شاید گاڑی ترچھی کھڑی کر کے خود کہیں اندھیرے میں کھڑے تھے، شیر خان اسٹرنگ پر اوندھا گر گیا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس نے سر نیچے کر لیا تھا اور زیتون بانو اور فرحی کو نیچے ہونے کے لیے کہا تھا۔ اور خود پھرتی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا تھا اور اترنے سے پہلے ڈیش بورڈ سے اپنا ریوالور بھی اٹھا لیا تھا...... اب وہ گاڑی کی آڑ لے کر اندھیرے میں کھڑا تھا۔ کسی نے دروازہ کھول کر کہا تھا۔

''حاقی دادا تو اللہ کو پیارا ہو گیا...... وہ دوسرا بندہ کہاں ہے۔ شاید نیچے اتر گیا ہے...... دیکھو اور اسے

بھون ڈالو۔''

یہ آواز اسے مانوس سی لگی تھی جیسے پہلے بھی سنی ہو...... بلاشبہ یہ آواز سائیں مٹھا کے اسی بندے کی تھی جس سے چند دن پہلے ٹکراؤ ہوا تھا۔

''عورت کو بھی گولی لگی ہے۔'' اس نے کسی کو بتایا تھا اور اس کا دل جیسے ڈوب کر ابھرا تھا اور نتائج کی پروا کیے بغیر اس نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر فائر کیا تھا۔ گولی اندھیرے میں کھڑے شخص کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اس کے منہ سے گالیاں نکلی تھیں...... اور ساتھ ہی گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی تھی۔ وہ ایک دم نیچے بیٹھ گیا تھا اور بیٹھتے ہوئے اس نے دیکھا تھا زیتون بانو روحان کو گود میں لیے درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگ رہی تھی۔ پتا نہیں کب وہ چپکے سے باہر نکلی تھی اور فرحی...... اس کا دل ڈوبا وہ دروازہ کھول کر فرحی کو دیکھنا چاہتا تھا کہ یک دم کسی نے درختوں کے جھنڈ کی طرف روشنی ڈالی تھی اور اس نے ایک شخص کو گن لہراتے ہوئے زیتون بانو کے پیچھے بھاگتے دیکھا تو فائر کیا...... گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی وہ لڑکھڑا کر گرا تھا۔ تب ہی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی تھیں۔ اس نے گرے ہوئے شخص کو اٹھ کر بھاگتے دیکھا اور پھر فرحی کی کراہ سن کر تیزی سے دروازے کھول کر اس نے فرحی کو آواز دی جو گہری گہری سانسیں لے رہی تھی اور خون تیزی کے ساتھ اس کی گردن اور جسم سے نکل رہا تھا۔

''فرحی، فرحی۔'' وہ دیوانہ وار اسے پکار رہا تھا جب آگے پیچھے دو جیپس آ کر رکی تھیں...... اور تین چار فوجی جوان جیپ سے اتر کر اس کی گاڑی کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔

''کیا ہوا؟ کون لوگ تھے؟ ڈاکو تھے یا ذاتی دشمنی......'' کئی آوازیں بیک وقت آئی تھیں لیکن وہ تو فرحی کی بند آنکھوں اور تیزی سے سپید پڑتی رنگت کو دیکھ رہا تھا۔

''میں میجر دانیال ہوں۔'' ایک شخص نے اپنا تعارف کروایا تھا۔ ''یہ غالباً آپ کی......''

''میری وائف ہیں۔'' اس نے فرحی کا سر اپنی گود میں رکھا تھا۔

ایک نے شیر خان کو سیدھا کرتے ہوئے نبض چیک کی اور مایوسی سے سر ہلایا تھا۔

''آپ اپنی وائف کو لے کر فوراً کسی نزدیک ترین اسپتال پہنچنے کی کوشش کریں۔ شاید سروائیو کر جائیں۔ البتہ آپ کا ساتھی ختم ہو چکا ہے...... اس کی ڈیڈ باڈی بعد میں لے کر آتے ہیں۔'' میجر دانیال نے اسے کہنے کے بعد اپنے ساتھیوں کو بھی ہدایات دی تھیں اور انہوں نے ابتدائی طبی امداد کے طور پر فرحی کا بہتا خون روکنے کی کوشش کی تھی۔

''وہ خالہ زیتون اُدھر بھاگی تھیں۔ پلیز مجھے ان کو بھی لینا ہے۔''

جیپ میں بیٹھنے سے پہلے اس نے میجر دانیال سے کہا۔

''او کے...... ہم انہیں دیکھ لیتے ہیں...... آپ جلدی کریں۔ ہری اپ جوان۔'' میجر دانیال نے اپنی جیپ کے ڈرائیور سے کہا تھا... اور اسے تسلی دی تھی۔

''آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ ہم انہیں ڈھونڈ کر لے آتے ہیں۔''

اور وہ ایک متشکر سی نظر میجر دانیال پر ڈال کر جیپ میں بیٹھ گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم جلیل خان کو کس نے اطلاع دی تھی اور اسے کیسے پتا چلا تھا لیکن صبح ہونے سے پہلے ہی جلیل خان پہنچ گیا تھا۔

''خان بابا!'' وہ اس کے گلے لگ گیا تھا۔

''فرحی کو دو گولیاں لگی ہیں، گردن میں اور پیٹ میں...... خان بابا فرحی کو بچا لیں۔ اسے مت جانے دیں، روک لیں۔''

''مارنے اور بچانے والی ذات تو اللہ کی ہے ثمر حیات، تم بھی اللہ سے دعا کرو میں بھی کر رہا ہوں۔''

''خان بابا وہ شیر خان بھی چلا گیا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ''وہ کہہ رہے تھے کہ وہ نہیں بچا۔''

''ہاں۔'' جلیل خان کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا تھا اس کی آنکھیں خوں رنگ ہو رہی تھیں۔ وہ اس کا بہت پرانا اور وفادار ساتھی تھا۔ بہت مخلص......

''اور روحان وہ......'' جلیل خان کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس نے جلیل خان کی بات کاٹی۔

''روحان کو خالہ زیتون اٹھا کر خوفزدہ ہو کر بھاگی تھی۔ میجر دانیال نے کہا تھا کہ وہ انہیں ڈھونڈ کر لے آئیں گے۔''

''ہاں۔'' جلیل خان نے اس کا بازو تھپتھپایا تھا۔ ''انہوں نے زیتون خالہ کو تلاش کر لیا ہے۔''

''تو کیا آپ نے انہیں گھر بھجوا دیا ہے۔ یہ ٹھیک کیا ہے آپ.... یہاں رہ کر کیا کریں گے۔ روحان کا کون خیال رکھے گا پھر...... میں تو فرحی کے ٹھیک ہونے تک یہاں رہوں گا۔ اتنے عرصے تک زیتون خالہ اور روحان آپ کے پاس ہی رہیں گے تو مجھے اطمینان رہے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' جلیل خان نے سر ہلایا تھا۔

''فرحی ٹھیک ہو جائے گی ناں خان بابا؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''انشاء اللہ!'' جلیل خان نے پھر اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔ فرحی سی سی یو میں تھی، اس کے جسم سے گولیاں تو نکال دی گئی تھیں لیکن اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی...... جلیل خان کو شیر خان کی میت لے کر جانا تھا لیکن وہ جلیل خان کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا۔ جلیل خان کی طرح شیر خان نے بھی اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ وہاں ہی سی یو میں بیٹھا اس کے لیے آنسو بہاتا رہا تھا...... جلیل خان بارہ بجے کے قریب شیر خان کی ڈیڈ باڈی ملتے ہی اسے تسلی دے کر چلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ لاہور سے گلا با اور جیدا بھی آئے ہوئے تھے۔

''گھبرانا مت ثمر حیات، جنازے کے فوراً بعد آ جاؤں گا۔'' اور حسب وعدہ وہ آ بھی گیا تھا۔ جلیل خان کی موجودگی سے اسے ڈھارس ملتی تھی۔ وہ کتنی بار پوچھتا کہ فرحی ٹھیک ہو جائے گی اور ہر بار جلیل خان اسے تسلی دیتا لیکن تین دن بعد وہ زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔ مرنے سے کچھ دیر پہلے اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور وعدہ لیا تھا کہ وہ سائیں مٹھا سے اس کا انتقام نہیں لے گا کیونکہ اسے روحان کے لیے زندہ رہنا ہے اور اس نے وعدہ کر لیا تھا پھر وہ اس کی ڈیڈ باڈی لے کر خانیوال آئے تھے۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ صحن میں محلے کی عورتیں جمع تھیں۔ اس نے زیتون خالہ کو دیکھنا چاہا تھا لیکن وہ اسے نظر نہیں آئی تھیں اور جلیل خان اسے باہر لے آئے تھے جہاں کچھ مرد حضرات بیٹھے تھے۔

''خان بابا، روحان کو بلوا دیجیے۔'' جلیل خان نے سر ہلایا تھا لیکن روحان کو اس کے پاس کوئی نہیں لایا تھا...... اور جب فرحی کو ریحان کے پہلو میں دفنا کر وہ واپس گھر آئے تھے تب بھی اسے روحان اور زیتون خالہ نظر نہیں آئی تھیں۔

''خان بابا، آپ نے زیتون خالہ اور روحان کو لاہور سے بلوایا کیوں نہیں، وہ آخری بار اپنی ماں کا چہرہ دیکھ لیتا اور زیتون خالہ بھی تو فرحی کی ماں جیسی تھیں۔'' اس نے شکوہ کیا تھا اور تب جلیل خان نے اسے وہ سفاک حقیقت بتائی تھی جس نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ جلیل خان سر جھکائے کہہ رہا تھا۔

''زیتون خالہ کی لاش تو درختوں کے پیچھے مل گئی تھی۔ اس کے سر کے پچھلے حصے میں گولی لگی تھی لیکن آرمی کے

ہوا نوں کو تم نے روحان کے متعلق نہیں بتایا تھا اس لیے انہوں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اور زیتون بانو کی لاش لے کر چلے آئے۔ شاید روحان ڈر کر کہیں بھاگ کر آگے نکل گیا تھا۔ اِدھر اُدھر چھوٹی موٹی ''ڈھوکیں'' ہیں شاید اُدھر نکل گیا ہو۔ تم سے روحان کے متعلق معلوم ہوتے ہی میں نے بندوں کو دوڑا دیا تھا انہوں نے آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا لیکن کہیں سے کچھ پتا نہیں چلا...... میں خود بھی شیر خان اور زیتون کو دفنانے کے بعد وہاں گیا۔ اس جگہ کئی میل تک کوئی آبادی نہیں...... میں نے بھی نزدیکی گاؤں جا کر خود پتا کیا...... میرے بندوں نے بسوں اور ویگنوں کے ڈرائیوروں سے بھی پوچھا۔''

جلیل خان تفصیل بتا رہا تھا اور وہ سر جھکائے ساکت بیٹھا تھا۔

''ہم نے سائیں مٹھا کے ایک بندے کو بھی قابو کیا اور روحان کے متعلق پوچھ گچھ کی ہے لیکن وہ روحان کے متعلق کچھ نہیں جانتے...... وہ تو آرمی کی جیپ آتے دیکھ کر فوراً بھاگ کر گاڑی میں سوار ہو گئے تھے۔ وہ کل تین بندے تھے، ایک ڈرائیو کر رہا تھا اور دو بندوں نے نیچے اتر کر تم لوگوں کو گھیرا تھا۔ زیتون بانو کے پیچھے جانے والے بندے نے بھاگتے ہوئے گولی چلائی تھی جو زیتون بانو کو لگی پھر وہ خود بھاگ کر گاڑی میں سوار ہو گیا تھا۔ مجھے لگتا ہے وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ انہیں روحان کے متعلق کچھ پتا نہیں...... لیکن وہ مل جائے گا انشاء اللہ ضرور مل جائے گا...... ثمر حیات۔'' جلیل خان جانے کتنی ہی دیر اسے جھنجوڑتا رہا تھا۔ تب اچانک ہی اس کا سکتہ ٹوٹا تھا اور اس کے حلق سے چیخ نکلی تھی۔

''نہیں'' پھر وہ دیوانوں کی طرح دیواروں سے سر پٹخنے لگا تھا۔ روتا، بال نوچتا، دیوار سے سر مارتا...... جلیل خان بار، بار اسے سینے سے لگاتا۔ بازوؤں میں بھینچتا لیکن نہ اس کی تڑپ میں کمی آتی تھی...... نہ رونے میں...... تب جلیل خان نے ڈاکٹر کو بلوا لیا تھا جس نے اسے نیند کا انجکشن لگا دیا تھا۔ جب انجکشن کا اثر ختم ہوتا وہ یونہی دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر روتا، چلاتا...... تیسرے دن وہ اسی عالم جنون میں گھر سے نکل پڑا تھا اور ویگنوں اور بسوں پر سفر کرتا وہ لاہور میں مٹھا سائیں کے ٹھکانے پر جا پہنچا تھا۔ لیکن وہاں جا کر اسے پتا چلا تھا کہ صرف ایک دن پہلے وہ انگلینڈ چلا گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اس کے قدموں پر گر جائے گا، پاؤں پکڑ لے گا، منت کرے گا کہ اگر اس کا روحان اس کے پاس ہے تو اسے دے دے وہ ساری زندگی اس کا احسان مند رہے گا لیکن سائیں مٹھا جا چکا تھا۔ اس کے بنگلے میں صرف اس کے ملازم تھے جو نہیں جانتے تھے کہ وہ کب آئے گا...... وہ دلگرفتہ اور نڈھال سافٹ پاتھ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے کہاں جانا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ سڑک پر سے گزرتی گاڑیوں کو دیکھ کر بار، بار اسے خیال آتا تھا کہ وہ دوڑتا ہوا سڑک پر چلا جائے اور کوئی ایک گاڑی اسے کچلتی ہوئی گزر جائے اور پھر سب ختم ہو جائے یہ جو اذیت سے بدن کٹتا تھا اور اندر جیسے کوئی چھریاں مارتا تھا۔ سب تکلیفوں سے نجات مل جائے گی۔ سب عذاب ختم ہو جائیں گے لیکن کسی انجانی طاقت نے جیسے اسے فٹ پاتھ سے باندھ دیا تھا...... اگر روحان مل گیا...... وہ زندہ ہوا تو میرے بعد وہ اکیلا رہ جائے گا...... اور اگر فرحی نے وہاں پوچھ لیا کہ وہ روحان کو وہاں اکیلا کیوں چھوڑ آیا ہے تو وہ اسے کیا جواب دے گا...... وہ بہت دیر تک بیٹھا سڑک پر دوڑتی گاڑیوں کو دیکھتا رہا پھر اٹھ کر چل دیا تھا۔ کہاں؟ اسے خود معلوم نہیں تھا۔

بند آنکھوں کے پیچھے آنسو مچل رہے تھے کتنے سالوں بعد آج اس کی آنکھوں میں نمی اتری تھی۔ پاس پڑا فون کب سے بج رہا تھا وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھا لیکن اٹھایا نہیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جیسے زخموں کے ٹانکے کھل گئے تھے۔ اب وہ بلک، بلک کر رو رہا تھا۔ ماضی کی اذیت زندہ ہو گئی تھی اور وہ ہچکیوں سے رو رہا تھا فون پھر بجنے لگا تھا...... اب کے وہ چونکا اور اس نے فون اٹھا لیا تھا۔ ایک ہاتھ

سے آنسو پونچھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس نے فون آن کیا تھا۔
''تم فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے ثمر حیات؟'' جلیل خان کی ناراض سی آواز سنائی دی۔
''سوری بگ با......''
''کیا ہوا ثمر حیات، تم کچھ پریشان لگ رہے ہو تمہاری کئی مسڈ کالز بھی تھیں۔ میں رات اریک اور ولسن کے ساتھ تھا کچھ دیر پہلے ہی آیا ہوں، کہو کیا بات ہے، عظام کا دوست اب ٹھیک ہے کیا!''
''جی بگ با، میں آپ سے ملنا چاہتا تھا اس لیے فون کررہا تھا۔''
''ٹھیک ہے، میں نے رات آٹھ بجے ڈی ون میں میٹنگ رکھی ہے۔ کچھ مشورے کرنے ہیں اور......''
''لیکن بگ با مجھے اپنی ذاتی مسئلے پر بات کرنا تھی۔''
''ٹھیک ہے، میٹنگ کے بعد وہ بھی کرلیں گے۔ تم نے بتایا نہیں تم کیوں پریشان ہو، تمہاری آواز بھی بھاری ہورہی ہے۔''
''کچھ نہیں بگ با بس ماضی یاد آرہا تھا۔ فرحی اور روحان۔'' اس کی آواز بھرّا گئی تھی۔ آنسوؤں نے پھر یلغار کی تھی۔
''اسی لیے تو کہتا ہوں خود کو مصروف رکھا کرو...... یہ جو چند دنوں سے بالکل فارغ بیٹھے ہوناں تو۔'' جلیل خان کے لہجے میں بے حد نرمی اور ملائمت تھی۔ ''خیر رات کو ملاقات ہوتی ہے تو تفصیل سے بات کریں گے۔''
''اگر میں ابھی آجاؤں بگ با؟'' اس نے پوچھا۔
''اس وقت میں ڈی ٹو میں جارہا ہوں وہاں اریک کچھ مہمانوں کے ساتھ آنے والا ہے۔ پتا نہیں کب فارغ ہوتا ہوں تو پھر رات کو ہی ملاقات ہوگی، اللہ حافظ۔''
فون بند ہوگیا اور وہ فون صوفے پر رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ عظام نے جلدی آنے کو کہا تھا۔ ''عظام کے آنے سے پہلے کچھ فریش ہوجاؤں ورنہ وہ پریشان ہوجائے گا۔'' اس نے اپنے گیلے رخساروں پر ہاتھ پھیرا اور لاؤنج سے نکل کر اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ارتفاع، ڈاکٹر ایمن کی کلاس لے کر باہر نکلی تو کاریڈور میں کھڑی عالیہ نے اسے پکارا۔
''رتی......'' اس نے چونک کر عالیہ کی طرف دیکھا آج وہ بہت دنوں بعد یونیورسٹی آئی تھی لیکن اس نے کوئی کلاس اٹینڈ نہیں کی تھی۔ نہ وہ ڈاکٹر آصفی کی کلاس میں نظر آئی تھی اور نہ ہی سر لیاقت کی اور اب اس نے ڈاکٹر ایمن کی کلاس بھی اٹینڈ نہیں کی تھی۔ پتا نہیں کہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ ارتفاع نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی تھی اور قدم آگے بڑھا دیے۔ جس طرح اچانک اس نے ارتفاع سے قطع تعلق کیا تھا اس کی وجہ سے وہ دل ہی دل میں اس سے ناراض تھی۔
''رتی پلیز......'' وہ تیز تیز چلتی ہوئی اس کے قریب آئی تھی۔ ''میں جانتی ہوں تم مجھ سے خفا ہو...... اور تمہیں خفا ہونا بھی چاہیے لیکن پلیز تھوڑی دیر کے لیے میری بات سن لو......شاید آج کے بعد پھر کبھی ہماری ملاقات نہ ہو۔'' وہ اب اس کے ساتھ، ساتھ چل رہی تھی...... ارتفاع نے چونک کر اسے دیکھا وہ اس کی بہت اچھی دوست تھی......اسکول کے زمانے سے ان کا ساتھ تھا لیکن اب اچانک ہی بغیر کسی وجہ کے وہ اس سے کترانے لگی تھی۔ وہ فون کرتی تو کال کاٹ دیتی...... وہ کم، کم یونیورسٹی آتی اور زیادہ وقت فائنل کی لڑکیوں کے ساتھ گزارتی۔ کلاس میں بھی اسے نظر انداز کردیتی تھی۔ وہ اس کے اس رویّے سے بہت ہرٹ ہوئی تھی اور اب یہ عالیہ کیا کہہ رہی تھی کہ

شاید آج کے بعد پھر کبھی ملاقات نہ ہو۔ اس نے ذرا سا رخ موڑ کر اپنے دائیں طرف ساتھ، ساتھ چلتی عالیہ کی طرف دیکھا جو ملتجی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیوں، کیا تم یونیورسٹی چھوڑ رہی ہو؟''

''باہر چل کر آرام سے بات کرتے ہیں رتی بس تھوڑی دیر۔'' عالیہ نے التجا کی...... ارتقاع نے لمحہ بھر سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ اِکا دُکا اسٹوڈنٹ اِدھر اُدھر بیٹھے پڑھ رہے تھے یا خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک نسبتاً خالی گوشے میں وہ دونوں بیٹھ گئی تھیں۔ اپنا شولڈر بیگ گود میں رکھتے ہوئے ارتقاع نے بغور اپنے سامنے بیٹھی عالیہ کی طرف دیکھا جو سر جھکائے گھاس کے تنکے نوچ رہی تھی، اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں لگتا تھا وہ رو کر آئی تھی۔

''کیا ہوا عالی تم یونیورسٹی کیوں چھوڑ رہی ہو...... گھر میں سب خیریت ہے ناں؟'' ساری ناراضی بھول کر اس نے پریشانی سے پوچھا۔

''میری شادی ہو رہی ہے رتی۔'' عالیہ نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''رئیلی...... کہاں کس سے؟'' وہ ایکسائٹڈ ہوئی۔

''حیدر آباد میں پھپھو کے بیٹے سفیان حیدر سے۔'' عالیہ نے دھیمی آواز میں بتایا۔

''سفیان حیدر!'' ارتقاع نے دُہرایا ''لیکن تمہیں تو وہ بالکل بھی پسند نہیں تھا اور نہ ہی تم اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔''

''ہاں وہ مجھے پسند نہیں تھا۔'' وہ پھر گھاس توڑنے لگی تھی۔ ''کیونکہ میں کسی اور سے محبت کرتی تھی اور مجھے اسی سے شادی کرنا تھی۔''

''پھراب ایسا کیا ہوگیا ہے کہ تم ایک ناپسندیدہ شخص سے شادی کرنے جارہی ہو۔''

''اس لیے کہ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی آپشن نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ سفیان جیسا ظرف کسی کے پاس نہیں ہے۔'' عالیہ کی بات پر ارتقاع اپنی حیرانی نہ چھپاسکی۔

''یہ کیسی بات کررہی ہو تم...... میں تمہاری بات بالکل بھی نہیں سمجھ پائی...... تم خوش شکل ہو...... ایجوکیٹڈ ہو...... ایک ویل آف فیملی سے تمہارا تعلق ہے۔ تمہارے لیے بھلا رشتوں کی کیا کمی ہے، تمہاری تو اپنی فیملی میں سے کئی لوگ انٹرسٹڈ تھے۔ لیکن تم خود ہی کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں...... حالانکہ تمہارے ماموں زاد بھائی تو ہر لحاظ سے موزوں تھے اور خواہش مند بھی تھے۔''

''ہاں شاید اب بھی خواہش مند ہوں لیکن رتی ان میں سے کسی میں اتنا ظرف نہیں ہے کہ مجھے میری غلطیوں، خامیوں سمیت قبول کرلے...... اگر میں انہیں اپنے متعلق وہ سب کچھ بتادوں جو میں نے سفیان کو بتایا ہے تو وہ شاید مجھ سے کلام بھی نہ کریں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں لیکن سفیان نے کہا۔ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہے بس یہ کافی ہے جو ہوا اسے بھول جاؤ، میں بھی بھول جاؤں گا۔ اپنے ہی اپنوں کو ڈھانپتے ہیں، تم میرے ماموں کی بیٹی ہو اور تمہاری عزت مجھے ہر شے سے بڑھ کر ہے۔ مما خوش نہیں ہیں، وہ پھپو اور پھپو کی فیملی کو پسند نہیں کرتیں لیکن پپا خوش ہیں میرے فیصلے سے۔''

''ایسا کیا ہوا تمہارے ساتھ، کیا غلطی کی ہے تم نے؟'' ارتقاع نے الجھ کر اسے دیکھا۔

''رتی......'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''ہم لڑکیاں بعض اوقات محبت میں اندھی ہوجاتی ہیں اور اتنا آگے نکل جاتی ہیں کہ سب کچھ گنوا بیٹھتی ہیں۔ کاش میں جانتی ہوتی کہ میرے قدم کس طرف اٹھ رہے ہیں، کاش میں بہت آگے جانے سے پہلے اپنے قدم روک لیتی۔ لیکن اس وقت تو میں اس کی محبت میں پاگل ہورہی تھی۔ مجھے اس کی غلط بات بھی صحیح لگتی تھی۔'' آنسو اس کی آنکھوں میں چمکے کچھ دیر سر جھکائے وہ آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی۔

''اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں، ذکر تک نہیں کیا کہ تم کسی سے محبت کرنے لگی ہو۔'' اس نے بے اختیار گلہ کیا۔

''ہاں، وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہاں یونیورسٹی میں کسی کو ہمارے افیئر کا پتا چلے، ہم ہمیشہ باہر ہی ملتے تھے۔'' آنسو اس کی پلکوں کی باڑ توڑ کر رخساروں پر پھسل آئے۔

''عالی۔'' ارتقاع نے بے چین ہوکر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

''بعض اوقات ہماری ذرا سی لغزش ہماری زندگی اجاڑ دیتی ہے رتی۔'' اس نے ارتقاع کے ہاتھوں سے ہاتھ چھڑا کر رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو پونچھا۔

''کون تھا وہ عالی جس نے تمہیں دھوکا دیا۔'' ارتقاع بہت دکھ اور افسوس سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''پہلے روز یونیورسٹی میں اس نے مجھے فول بنایا تھا۔ وہ مجھے اچھا لگا تھا اور پھر ویلکم پارٹی پر اس نے مجھے گلاب کا پھول پیش کیا تھا اور میں اپنا دل ہار بیٹھی تھی۔''

''بھلا کس نے عالیہ کو ویلکم پارٹی پر گلاب کا پھول پیش کیا تھا۔'' ارتقاع نے یاد کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر جیسے یاد آنے پر چونکی تھی۔

''ظفر......''

''ہاں ظفری...... مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی...... ایسی محبت جو سب کچھ بھلا دے۔ پتا نہیں ہم لڑکیاں محبت کے معاملے میں اتنی بے وقوف کیوں ہوتی ہیں۔''

''لیکن وہ تو بہت کرپٹ ہے، دھوکے باز تم نہیں جانتیں اس نے میرے ساتھ۔'' وہ بولتے، بولتے یک دم رک گئی۔ رواحہ نے اسے منع کیا تھا وہ اس واقعے کے متعلق کسی سے بات نہ کرے۔

''میں جانتی ہوں۔'' عالیہ نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔

''تم کیسے جانتی ہو؟'' اس نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کیا ظفری نے تمہیں بتایا؟'' عالیہ کی آنکھوں میں بہت تیزی سے پانی اکٹھا ہوا تھا اور رخسار بھیگتے چلے گئے تھے۔

''مجھے تم سے معافی مانگنی تھی رتی...... پلیز مجھے معاف کردو۔''

''کیسی معافی...... کیا، کیا ہے تم نے عالی...تمہیں کیا ہوگیا ہے کیسی باتیں کر رہی ہو۔'' ارتقاع حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ بہت برا کیا، پہلے میں اپنی محبت سے مجبور ہوئی اور پھر بلیک میل ہوئی۔ اس نے کہا اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ میرے پورے خاندان اور یونیورسٹی میں میری ایسی تصاویر تقسیم کردے گا کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ میں نے تو کبھی کوئی تصاویر نہیں بنوائی تھیں۔ نہ ہی مجھے اس کا علم تھا کہ اس نے کب میری تصاویر لیں پھر بھی میں ڈر گئی تھی' میں نے پڑھ رکھا تھا کہ آج کل کسی جسم کے ساتھ کوئی چہرہ کیمرا ٹرک کے ذریعے آسانی سے جوڑا جاسکتا ہے۔ تم تو جانتی ہو ناں پپا تھوڑے سخت ہیں، مما کی طرح لبرل نہیں ہیں۔ وہ تو مجھے یونیورسٹی بھی بھیجنا نہیں چاہتے تھے اگر ایسی کوئی تصاویر انہیں ملتیں تو وہ تو مرہی جاتے اور بھائی کبھی سر اٹھا کر نہ جی سکتے۔ کون میری بات کا یقین کرتا کہ وہ میری تصاویر نہیں ہیں، بس خود غرض ہوگئی تھی۔ میں نے صرف اپنا سوچا تمہارا نہیں...... ظفری نے کہا تھا تمہیں اس کے گھر لے آؤں، میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ ظفری نے کسی کو ٹریٹ نہیں دی تھی۔ وہ تو صرف تمہیں۔'' اب وہ زاروقطار رو رہی تھی اور ارتقاع مبہوت سی بیٹھی اس کی بات سن رہی تھی۔

''میں تم سے نظر نہیں ملا سکتی تھی، اس لیے تمہارا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی...... ظفری کے فارم پر جانے کے لیے بھی اس کے اصرار پر ہی میں نے تمہیں تیار کیا تھا۔'' اس نے روتے، روتے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''رتی پلیز مجھے معاف کردو۔''

''اوکے یار...... اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس کے شر سے بچالیا۔'' ارتقاع نے اس کے جڑے ہاتھ کھولے۔

''ناؤ ریلیکس عالی...... اتنی ٹینس نہ ہو، دیکھو وہ لڑکیاں ہماری طرف دیکھ رہی ہیں، مت روؤ پلیز۔'' اس نے کچھ فاصلے پر بیٹھی لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا جو ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ عالیہ نے دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ اچھی طرح صاف کیا۔

''کوئی شخص اتنا بھی منتقم مزاج ہوسکتا ہے مجھے یقین نہیں آتا عالی۔ محض کئی سال پہلے مارا جانے والا تھپڑ......''

''نہیں، تم نے ظفری کو تھپڑ نہیں مارا تھا رتی، وہ تو نہ جانے کون تھا...... یہ تو اس سے یونہی میں نے ایک بار ذکر کردیا تھا کہ کیسے چاند رات کو تم نے ایک لڑکے کو تھپڑ مارا تھا۔'' عالیہ نے اس کی بات کاٹی...... ارتقاع نے سر ہلایا۔

''اور اگر وہ تمہاری سسرال پہنچ گیا تو؟'' ارتقاع نے خدشہ ظاہر کیا۔

''نہیں، وہ ایسا نہیں کرے گا۔'' عالیہ نے یقین سے کہا۔

''تم اتنے یقین سے یہ کیسے کہہ سکتی ہو عالی۔ ایسے شخص سے کچھ بھی امید نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ تم اپنے پپا سے بات کرو، تھوڑے بہت خفا ضرور ہوں گے لیکن پھر معاملہ سنبھال لیں گے۔'' ارتقاع، عالیہ کے لیے پریشان ہوگئی تھی۔

''اس نے مجھ سے معذرت کرلی ہے اور اس کے پاس کوئی تصاویر نہیں ہیں، اس نے مجھے یوں ہی ڈرا دیا تھا۔''

''اور تم نے اس کی بات کا یقین کرلیا عالی!'' ارتفاع کو اس کے یقین پر حیرت تھی۔

''یہ کوئی فلمی اسٹوری نہیں ہے کہ کوئی غنڈا لمحوں میں شریف آدمی بن گیا۔ تبدیلی کے عمل میں تو وقت لگتا ہے۔''

''میں نہیں جانتی لیکن وہ بدل گیا ہے۔ اس کے چہرے پر شرمندگی جھلکتی تھی۔'' عالیہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''اچھا...... اگر وہ اتنا ہی شرمندہ تھا تو تم سے شادی کیوں نہیں کرلیتا۔ محبت کا کھیل کھیلا تھا تمہارے ساتھ۔'' ارتفاع کے لہجے میں تلخی تھی۔

''اس کا نکاح اس کی پھپو کی بیٹی سے ہوچکا ہے اور اس کی بہن اس کی پھپو کی بہو ہے۔ ان کے ہاں ایسے ہی وٹے سٹے کی شادیاں ہوتی ہیں۔''

''جب وہ تم سے محبت کا ڈراما کررہا تھا تو تب اسے اس کا علم نہیں تھا۔ عالی تم اب بھی اس سے محبت کرتی ہو اور اسے مارجن دے رہی ہو لیکن مجھے اس پر اعتبار نہیں ہے...... پلیز ہوشیار رہنا اس سے اور کبھی اس سے رابطہ مت رکھنا۔'' اس کے لہجے میں ہنوز تلخی تھی۔

عالیہ نے جھکا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں اس کی وکالت نہیں کررہی رتی۔ میرے دل نے اس کی بات پر یقین کرلیا جب وہ مجھ سے بات کررہا تھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں سچ نظر آیا تھا۔ وہ فطرتاً برا نہیں ہے بس۔''

''اچھا......'' ارتفاع طنزیہ ہنسی۔ ''وہ فطرتاً برا نہیں ہے میرے ساتھ اچھا کرنے جا رہا تھا۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا بھلا۔''

''اسے تم سے کوئی دشمنی نہیں تھی وہ تمہارے گھر کا ہی کوئی فرد تھا جو تمہیں برباد کرنا چاہتا تھا اور اس نے ظفری سے۔''

''کیا بک رہی ہو عالی...... بھلا میرے گھر کا کوئی فرد کیوں مجھے برباد کرنا چاہے گا۔'' وہ یک دم بھڑکی تھی۔ ''جھوٹ بولا ہے اس نے تم سے۔''

''شاید لیکن اس نے مجھے یہی کہا تھا جب میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کیوں تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے تو اس نے کہا تھا کہ تمہارے گھر کا ہی کوئی فرد ایسا چاہتا ہے کہ ایک دو روز تم گھر سے باہر رہو، وہ تمہیں اور کوئی نقصان نہیں پہنچاتا بس دو روز تک تمہیں روکے رکھتا...... فارم ہاؤس میں بھی کسی بہانے وہ تمہیں وہاں ہی بند کرآتے۔''

''واٹ آنان سینس...... میرے گھر میں ہے ہی کون۔ کون پاپا، افنان، میں اور ماما...... نو نیوز......'' وہ شولڈر بیگ اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔

''بھلا ان میں سے کون مجھے بدنام کرنا چاہے گا...... پاپا اور افنان مجھ پر جان چھڑکتے ہیں اور ماما......'' یک دم وہ ٹھٹکی۔ ''کیا ماما...... کیا وہ ایسا کرسکتی ہیں، آخر کو سوتیلی ماں ہیں لیکن کیا وہ اتنی گر سکتی ہیں۔'' اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ ''ہاں شاید کر بھی سکتی ہیں۔'' اس کے دل میں ایک لمحے کے لیے آیا اور اس نے رات کی گفتگو یاد کی...... رواحہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی ماما سے اس کے متعلق بات کرلے تاکہ جب اس کے بابا آئیں تو اس کے ماما، پاپا کو پتا ہو کہ اس میں اس کی پسند بھی ہے۔ وہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچیں اور رات ماما اس کے کمرے میں آئیں تو انہوں نے خود ہی رواحہ کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔

''تمہارا کلاس فیلو اب کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہے ماما۔'' اس نے حیران ہو کر ایمل کو دیکھا تھا جو رواحہ کا حال پوچھنے کے بعد روم چیئر پر بیٹھ گئی تھیں۔ ایمل بہت کم اس کے کمرے میں آتی تھی۔ جب کبھی اس کی طبیعت خراب ہوتی تھی لیکن آج وہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی بیٹھ گئی تھی۔

''ماما کیا آپ کو کچھ بات کرنی ہے۔'' اس نے پوچھا تھا۔

''ہاں......'' وہ چونکی تھیں۔

''مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے، دورانِ تعلیم میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے جب بھی کسی نے تمہارے رشتے کی بات کی میں نے ٹال دیا لیکن اب ہمدانی صاحب نے اپنے بھانجے کے لیے ممی سے بات کی ہے۔''

''تو......'' اس نے بھویں اچکائی تھیں۔

''یہ رشتہ ہر لحاظ سے بہترین ہے ارفی...... ہمدانی صاحب چاہتے ہیں کہ بھلے منگنی، شادی تمہاری ایجوکیشن ختم ہونے کے بعد ہوتی رہے لیکن اقرار، انکار جو بھی ہو ہم ابھی کر دیں کیونکہ ان کی نظر میں ایک دو اور رشتے بھی ہیں اور انکار کی صورت میں وہ اُدھر بات چیت کر سکتے ہیں۔''

''تو کر لیں اُدھر، مجھے ہمدانی صاحب کے بھانجے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' بابر کے بے جا لاڈ نے اسے اچھا خاصا خودسر اور منہ پھٹ بنا دیا تھا۔

ایمل نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

''بیٹا مل لینے میں کیا حرج ہے، بابر کہہ رہے تھے لاہور جانے کو...... اس ویک اینڈ پر چلے جائیں گے۔ تمہیں اچھا لگے، پسند ہو تو۔'' ایمل کا لہجہ نرم تھا لیکن اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

''مجھے نہیں کرنی ہمدانی صاحب کے بھانجے سے شادی اور نہ ہی کسی اور سے۔''

''کیوں......؟'' ایمل کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''اس لیے کہ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔'' اس نے سوچا تھا کہ رواحہ کے متعلق بات کرنے کا اس سے اچھا موقع اور نہیں ملے گا۔

''کون ہے وہ......؟'' ایمل اب بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''رواحہ......'' اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔ ''میں اس سے محبت کرتی ہوں اور مجھے اس کے علاوہ کسی اور کے ساتھ شادی نہیں کرنی۔''

''دیکھو بیٹا...... یہ محبت وحبت سب کتابی باتیں ہیں، محض پسندیدگی اور لگاؤ کو لڑکیاں محبت سمجھ لیتی ہیں۔ لڑکے سنجیدہ نہیں ہوتے ارفی وہ محض وقت گزاری اور......'' ایمل اسے سمجھانا چاہتی تھی لیکن اس نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''رواحہ ایسا لڑکا نہیں ہے ماما...... بہت سلجھا ہوا اور اچھا لڑکا ہے۔ اس کے بابا کالج میں پڑھاتے ہیں، پروفیسر ہیں...... بہت نائس اور شفیق انسان ہیں۔'' رواحہ کے ذکر سے اس کی آنکھوں میں قندیلیں سی جل اٹھی تھیں۔ ایمل کچھ دیر کے لیے کھوسی گئی تھی لیکن پھر جب اس نے ارتفاع کی طرف دیکھا تو اس کی پیشانی پر لکیریں پڑی تھیں۔

''تمہارے پاپا کسی پروفیسر کے بیٹے سے ہرگز تمہاری شادی نہیں کریں گے اس لیے تم رواحہ کا خیال ذہن سے نکال دو۔'' پہلی بار اس نے ایمل کے لہجے میں سختی سی محسوس کی تھی۔ وہ اور بھڑک اٹھی تھی۔

''رواحہ ایک پروفیسر کا بیٹا ہے، وہ اگر ایک مزدور کا بیٹا بھی ہو تب بھی مجھے اسی سے شادی کرنی ہے۔ رہی پاپا کی بات تو میں جانتی ہوں کہ انہیں اعتراض نہیں ہوگا، وہ ہمیشہ میری خوشی پر خوش ہوتے ہیں، آپ اپنی بات کریں۔

آپ چاہتی ہیں کہ میری شادی ہمدانی صاحب کے بھانجے سے ہو یقیناً ممی کا اور آپ کا کوئی مفاد وابستہ ہوگا اس سے آخر وہ نانا کے......''

''رتی......'' عالیہ بھی اس کے ساتھ کھڑی ہوگئی تھی اور اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''ہوسکتا ہے ظفری نے مجھ سے جھوٹ بولا ہو لیکن اس نے مجھ سے ایسا ہی کہا تھا۔ لیوایٹ یقیناً جھوٹ ہی کہا ہوگا۔ تمہیں تنگ کرنے کا کوئی جواز دینا تھا ناں اس نے۔'' اس نے بہت زخمی نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔

''ہوسکتا ہے وہ سچ ہی کہہ رہا ہو۔'' اپنی بات کر کے وہ رکی نہیں تھی اور شولڈر بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے تیز، تیز چلنے لگی۔ اندر ایک ہی آواز آرہی تھی۔ ''ماما...... ماما کیا وہ اتنی گر سکتی ہیں۔ اتنی گھٹیا حرکت کرسکتی ہیں، شاید نہیں...... شاید ہاں...... سنڈریلا کی اسٹیپ مدر نے بھی تو......'' وہ ہونٹ بھینچے تیز، تیز چل رہی تھی۔ اندر آتش فشاں ابل رہا تھا۔ عالیہ بھی اس کے ساتھ، ساتھ چل رہی تھی۔

''کیا تم، باقی کی کلاسز اٹینڈ نہیں کرو گی؟''

''نہیں......'' اس کے لہجے میں عجیب طرح کی سختی تھی۔

''رتی تم نے مجھے معاف کردیا ہے ناں...... میری شادی پر آؤ گی ناں۔'' اس نے صرف اثبات میں سر ہلایا تھا۔ تب ہی سامنے سے آتے فائنل کے ایک لڑکے نے اسے روکا۔

''تم نے سنا ظفری کے چچا سکندر سومرو اُن کی بیوی، بیٹا گاڑی کے حادثے میں جاں بحق ہوگئے ہیں۔'' عالیہ رک کر تفصیل پوچھنے لگی تھی۔ ارتفاع کے قدم لحہ بھر کے لیے رکے تھے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ عالیہ کو وہاں ہی باتیں کرتا چھوڑ کر اسی تیزی کے ساتھ پارکنگ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

''اگر پاپا کو پتا چلے کہ ماما نے میرے ساتھ ایسا کیا ہے تو وہ تو انہیں کھڑے، کھڑے گھر سے نکال دیں۔ لیکن ماما، ظفری کو کیسے جانتی ہیں اور پھر ماما کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے کہ وہ ماما کے کہنے پر مجھے برباد کرنا چاہتا تھا۔'' ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں آیا تھا۔ ''ہوسکتا ہے ظفری نے جھوٹ بولا ہو عالیہ سے...... لیکن اسے بھلا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ ضرور ماما نے ہی میرے خلاف کوئی سازش کی ہوگی...... مجھے پاپا کی نظروں میں گرانے کے لیے......'' اس کے ساتھ خرابی یہ تھی کہ اسے اپنے اندازوں کے صحیح ہونے کا سو فی صد یقین ہوتا تھا اور وہ فوراً ہی اپنے اندازوں پر یقین کی مہر ثبت کردیتی تھی جیسا کہ اسے یقین تھا کہ ایمل اس کی سگی ماں نہیں ہے اور افنان کی کوئی بھی دلیل کوئی بھی بات اسے قائل نہیں کرسکی تھی۔ اگرچہ وہ خاموش ہوگئی تھی لیکن آج وہ ضرور ایمل سے باز پرس کرے گی کہ اگر وہ اس کی سگی بیٹی ہوتی تو کیا وہ تب بھی اسے برباد کرنے کی سازش کرتیں...... وہ آندھی طوفان کی طرح گاڑی اڑاتی گھر پہنچی تھی۔ دو دفعہ تو چالان ہوتے، ہوتے بچا تھا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے ہونٹ بھینچے جب وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو ایمل فون پر بات کررہی تھی...... ایک نفرت بھری نظر ایمل پر ڈال کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ ایمل کہہ رہی تھی۔

''ہمارا پروگرام تو تھا آنے کا لیکن پھر بابر مصروف ہوگئے ہیں کچھ...... ابھی بات کرتی ہوں بابر سے...... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں...... آپ پریشان لگ رہی ہیں۔'' دوسری طرف سے ممی نے کچھ کہا تھا...... ایمل نے جواب دیا تھا۔ ''جی ممی، ظاہر ہے سب ہی آئیں گے بابر کہہ رہے تھے افی اور ارتفاع بھی دو دن کی رخصت لے لیں گے۔''

''مجھے نہیں جانا، آپ کی ممی کے گھر......'' اس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے کسی قدر بدتمیزی سے کہا تو ایمل نے مڑ کر ناراض سی نظر اس پر ڈالی اور پھر فون کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''اچھا ممی خدا حافظ...... بابر سے بات کر کے آپ کو بتاتی ہوں۔'' ریسیور کریڈل پر رکھ کر اس نے ارتفاع کی طرف دیکھا جس کا رنگ سرخ ہورہا تھا اور آنکھوں سے جیسے آگ نکل رہی تھی۔

''کیا ہوا ارفی بیٹے، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟'' چند لمحے پہلے اس کا بدتمیزی سے بولنا بھول کر ایمل نے اس کے قریب جا کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔
''اُف... کس قدر ڈرامہ باز ہے یہ عورت...... ایک طرف مجھے برباد کرنے کی سازش اور دوسری طرف یہ لگاوٹ......'' ارتقاع نے اپنے بازو پر رکھا اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
ایمل حیرت زدہ سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔
''میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔''
''یہ کیا بدتمیزی ہے ارفی، ماں سے بات کرنے کا یہ طریقہ ہے۔'' ایمل حیرت کے جھٹکے سے باہر آئی۔
''ماں......'' ریلنگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ تلخی سے ہنسی۔ ''نہیں ہیں آپ میری ماں......'' اس کی آواز قدرے بلند تھی۔
''آواز نیچی رکھو ارفی اور مت بھولو کہ کس سے بات کر رہی ہو۔ ماں ہوں میں تمہاری۔''
''مت دھوکا دیں خود کو اور مجھے۔'' ارتقاع نے تنفر سے اسے دیکھا۔
''میری ماں تو کیا آپ سرے سے ماں کہلانے کی ہی مستحق نہیں ہیں، مائیں بیٹیوں کی زندگی برباد کرنے کی سازشیں نہیں کرتیں۔ اگر آپ کی اصلی شکل انی اور پاپا دیکھ لیں تو نفرت کرنے لگیں آپ سے اور پاپا تو ایک لمحے کے لیے برداشت نہیں کریں آپ کو اس گھر میں۔'' وہ اسی طرح ریلنگ پر ہاتھ رکھے تنفر سے اسے دیکھ کر بولے جا رہی تھی۔
''ارفی......'' ایمل کے لبوں سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی تھی۔ ''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟''
''کاش دماغ ہی خراب ہوتا میرا۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ ''اور یہ جھوٹ ہوتا لیکن یہ بہت بھیانک سچ ہے کہ آپ نے ظفری کے ساتھ مل کر مجھے ذلیل کرنے کی سازش کی۔ وہ تو اللہ نے مجھے بچا لیا۔''
''یہ کیا بکواس ہے ارتقاع...... میں کسی ظفری کو نہیں جانتی۔'' ایمل کی آواز بھی بلند تھی اور اوپر سیڑھی پر کھڑے بابر نے ایمل کی پوری بات سنی تھی اور تیزی سے نیچے آیا تھا۔
''کیا ہوا بھئی، یہ ماں، بیٹی کیوں تلواریں سونتیں کھڑی ہیں۔''
''پاپا۔'' ارتقاع روتے ہوئے اس کے ساتھ لگ گئی۔
''ارے...... ارے روتے نہیں گڑیا، میری جان بابر نے اس کے سر پر پیار کیا۔
''پاپا......'' ایمل نے روتے ہوئے اسے بتایا۔ ''ظفری مجھے بدنام اور ذلیل کرنا چاہتا تھا اور ایسا وہ ہمارے گھر کے کسی فرد کے کہنے پر کرنا چاہتا تھا اور گھر کا وہ فرد ماما کے علاوہ بھلا اور کون ہو سکتا ہے۔'' ایمل ہکا بکا سی کھڑی اس کی بات سن رہی تھی۔
''او کے...... او کے ریلیکس......'' بابر نے اس کا بازو تھپتھپایا۔ ''ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے تمہیں، بھلا تمہاری ماما ایسا کیسے کر سکتی ہیں۔''
''کیوں نہیں کر سکتیں...... سوتیلی ماں کچھ بھی کر سکتی ہے۔''
''میں تمہاری سوتیلی ماں نہیں ہوں، سگی ماں ہوں۔'' ایمل اسے سیڑھیوں پر چڑھتے دیکھ کر چیخی تھی۔
''جاؤ شاباش بیٹا اپنے کمرے میں جاؤ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ۔'' بابر نے ارتقاع سے کہا اور پھر ایمل کی طرف متوجہ ہو گیا جس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔
''بتائیں اسے بابر کہ میں اس کی سگی ماں ہوں اب حقیقت بتا دیں اسے...... آج سچ کہہ دیں۔'' ایمل نے روتے

ہوئے اس کا بازو جھنجوڑا۔

''وہ مجھ پر الزام لگا رہی ہے کہہ رہی ہے کہ میں اسے برباد کرنا چاہتی ہوں۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس کی ماں ہوں، سگی ماں اور صرف اس کی خاطر میں نے...... اسے باپ کی شفقت دینے کے لیے شادی کی آپ سے۔'' وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکی لیکن بابر نے اسے روک لیا اور اپنے بازو کے گھیرے میں لیے اسے صوفے تک لایا۔

''بیٹھو...... بیٹھ جاؤ، آرام سے، سکون سے بات کرتے ہیں۔''

''نہیں، مجھے جانے دیں۔ اسے حقیقت بتانے دیں کہ میں اس کی سگی ماں ہوں، میں نے جنم دیا ہے اسے۔''

''ٹھیک ہے، بتا دیتے ہیں، بتا دیں گے پہلے تم ریلیکس ہو جاؤ۔'' اس نے اس کے کندھوں پر ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے ہوئے اسے صوفے پر بٹھایا اور نازو کو آواز دے کر پانی لانے کو کہا۔ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے...... اور دل ہی دل میں دانت پیسے...... اس ظفری کو بھلا کیا ضرورت تھی۔ کچھ بتانے یا اعترافِ گناہ کرنے کی تھینک گاڈ کہ اس نے میرا نام نہیں لیا۔ پتا نہیں اچانک ہی کیوں اسے شریف بننے کا دورہ پڑا ہے۔ ظفری سے اس کی ملاقات یہاں کراچی میں ہی دو سال پہلے ایک بزنس پارٹی میں ہوئی تھی۔ عمروں میں بہت فرق ہونے کے باوجود دونوں میں دوستی ہو گئی تھی۔ بابر کے پاس یہ ہنر تھا کہ وہ چھوٹے بڑے ہر ایک سے فوراً بے تکلف ہو جاتا تھا اور اسے اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا۔ ان دو سالوں میں ظفری کے فارم ہاؤس میں ہونے والی کئی پارٹیوں میں شریک ہوا تھا۔ کئی بار اس کے ساتھ شکار پر گیا تھا۔ اس دوستی میں ظفری کی نسبت بابر کا زیادہ ہاتھ تھا، وہ جانتا تھا کہ ظفری جیسے لوگوں سے تعلق رکھنے میں فائدے ہی ہیں...... اور ظفری تو تھا ہی یاروں کا یار...... بابر نے ارتقاع کو بگاڑنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی...... لیکن ہر ممکن آزادی دینے کے باوجود نتیجہ اس کے حسبِ منشا نہیں نکلا تھا۔ بس یہ ہوا تھا کہ وہ کچھ خود سر اور ضدی ہو گئی تھی اس کے علاوہ اس کے کردار میں کہیں کوئی خرابی نہ تھی۔ جب اسے پتا چلا تھا کہ ظفری...... اس کا یونیورسٹی فیلو ہے تو اس کے چالاک ذہن میں ایک منصوبہ آیا تھا...... وہ ارتقاع اور ایمل کو زندہ درگور کر دینا چاہتا تھا۔ دو تین روز ارتقاع گھر سے غائب رہتی تو دونوں جیتے جی مر جاتیں...... اور افنان جو ابھی اس پر جان چھڑکتا تھا اس سے نفرت کرنے لگتا...... افنان اس کا بیٹا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ وہ مدثر حسن کی بیٹی سے اتنی ہی نفرت کرے جتنی وہ کرتا ہے۔ اس نے اچھی طرح غور کرنے کے بعد ظفری سے بات کی تھی۔ وہ جانتا تھا ظفری خود بھی کوئی پارسا نہیں ہے۔ وہ اس سے وجہ پوچھے بغیر اس کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتا تاہم اس نے اسے بتایا تھا کہ ارتقاع اس کی بیوی کے پہلے شوہر سے ہے اور اس نے اسے زندگی میں ایسی زک پہنچائی تھی کہ وہ اس کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ آج تک انتقام کی آگ اس کے سینے میں جلتی ہے۔ بس دو تین روز تک اسے اپنے فارم یا گھر میں بند رکھے اور پھر آزاد کر دے۔ ظفری نے زیادہ کرید نہیں کی تھی اور حامی بھر لی تھی۔ لیکن چند دن پہلے ظفری نے اس سے معذرت کر لی تھی اور کہا تھا کہ وہ لڑکی سے انتقام لینے کے بجائے اس کے باپ کو تلاش کرے وہ ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہے...... اور وہ ظفری کو یہ بھی نہیں بتا سکا تھا کہ اس نے ایک دوسرا آپشن بھی رکھا ہوا تھا۔ اور دو بار کی ناکامی کے بعد اس نے دوسرے آپشن پر کام کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''پانی...... '' نازو پانی لے آئی تھی...... اس نے نازو کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر خود ایمل کے ہونٹوں سے لگایا لیکن ایمل نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر چند گھونٹ بھر کر گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔

''پتا نہیں کون اس کے ذہن میں یہ زہر بھر رہا ہے لیکن اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوگا۔''

''میں اسے سب کچھ بتا دوں گا۔''

''اب وہ بچی نہیں، کچھ نہیں ہوگا اسے۔ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔ ہرٹ ہو گی لیکن سنبھل جائے گی۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' بابر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔

''اب وقت آگیا ہے کہ اسے سب معلوم ہو جانا چاہیے۔''
''فون کس کا تھا؟'' اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہو گیا۔
''ممی کا...... بہت اداس ہو رہی تھیں تنہائی...... اکیلا پن...... ہم بھی اتنے دور ہیں۔'' ایمل اداس ہو گئی تھی۔ ''آپ نے کہا بھی تھا...... دو تین دنوں کے لیے سب چلیں گے۔ لیکن......''
''ہاں یار میں کچھ مصروف ہو گیا تھا اِدھر اب افنان کے ٹیسٹ چل رہے ہیں، رتی اور افنان کو چھوڑ کر ہم دونوں کل ہی چلتے ہیں، میں اپنی اور تمہاری سیٹ کب کروا دیتا ہوں۔'' ایمل کا ہاتھ اب بھی بابر کے ہاتھ میں تھا۔
''افنان کے ٹیسٹ ہو رہے ہیں تو ارفی کو ساتھ لے چلتے ہیں ...'' پتا نہیں کیوں ایمل، ارتفاع کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔
''نہیں ایما اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ اسے رہنے دو، میں افنان کو تاکید کر دوں گا کہ کالج سے آنے کے بعد گھر پر ہی رہے...... آ کر اس سے بات کریں گے تب تک اس کا موڈ بھی ٹھیک ہو جائے گا، ممی سے بھی مشورہ کر لینا کہ کیسے بات کرنی ہے۔ بلکہ ہم دو تین روز رہ کر ممی کو بھی ساتھ ہی لے آئیں گے۔ زیادہ نہیں تو ہفتے دو ہفتے کے لیے۔ سوری ایما میں اپنے بزنس میں مسلسل ہونے والے نقصان کی وجہ سے اتنا پریشان تھا کہ ممی کی طرف سے غافل ہو گیا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہو گا۔''
بابر نے کہا تو ایمل نے متشکر نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ بابر نے کبھی اسے مایوس نہیں کیا تھا ممی پتا نہیں کیوں اس کے متعلق کچھ مشکوک تھیں۔ کچھ عرصے سے بھی، کبھی اس کا رویہ کچھ کھردرا سا ہو جاتا تھا لیکن اس نے ہمیشہ ایمل اور ارتفاع کا خیال رکھا تھا۔
''ٹھیک ہے۔'' ایمل نے بابر کی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا تھا۔
''واپس آ کر آپ ہی بات کر لیجیے گا۔ آپ پر بہت ٹرسٹ کرتی ہے۔ آپ کی بات سنے گی بھی اور سمجھے گی بھی۔''
''او کے اب رونا نہیں بالکل اور رتی کو ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور افنان سے بھی کچھ مت کہنا۔'' بابر کھڑا ہو گیا۔ ''مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ واپسی پر سیٹیں بک کروا دوں گا۔ تم تیاری کر لینا شام کی ہی کسی فلائٹ سے نکل جائیں گے۔''
ایمل نے سر ہلایا وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ بابر اس کا رخسار تھپتھپاتا ہوا لاؤنج سے نکل گیا...... اور گاڑی میں بیٹھتے ہی وسیم کا نمبر ملایا۔
''کہاں ہو وسیم...... اوہ اچھا کراچی پہنچ گئے ہو گڈ...... اب وقت آگیا ہے کام کا...... کل یونیورسٹی سے واپسی پر بہت احتیاط سے کام کرنا ہے۔ غلطی کی گنجائش نہیں ہے میں اور ایمل کل صبح لاہور جا رہے ہیں، میری عدم موجودگی میں یہ کام ہو جانا چاہیے۔ تم نے وہی کرنا ہے جو میں نے تمہیں سمجھایا ہے۔''
''اور اگر اس نے لفٹ نہ دی۔''
''دے گی، میں اسے تم سے زیادہ جانتا ہوں بس تمہاری ایکٹنگ جاندار ہونی چاہیے...... اور ہر اگر کا ایک متبادل بھی ہوتا ہے، تمہارے پاس ہمیشہ دوسرا آپشن ہونا چاہیے۔ تم وہاں ہی ٹھہرے ہوئے ہو ناں بہتر ہے کہ تھکاوٹ اتار کر ایک بار شاہجہان سے ملاقات کر لو۔'' بابر نے فون آف کر دیا تھا کیونکہ اسے اب شاہجہان کی طرف جانا تھا جو لاہور سے آچکی تھی، ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا تھا کہ ارتفاع کے ساتھ ایسا کر کے اسے کیا فائدہ ہو گا۔
کرنل، حامد نے پراپرٹی ارتفاع کے نام کی تھی اس لیے وہ ارتفاع سے مختار نامے پر دستخط کروا چکا تھا اور اس کی فروخت کے لیے ایک پراپرٹی ڈیلر سے اس کی بات بھی چل رہی تھی۔ پھر وہ ارتفاع کے ساتھ ایسا کیوں کرنا چاہتا تھا۔ اس

کے پاس اس کیوں کا جواب نہیں تھا۔ مدثر اور ایمل کے بیٹے کو پہلے ہی وہ شاہجہان کے پاس بھجوا چکا تھا اور اب بیٹی بھی...... اس نے ہولے سے سر جھٹکا...... اور اس کے لبوں پر ایک پُر اسراری مسکراہٹ بکھر گئی...... اور وہ گاڑی گیٹ سے باہر نکال لے گیا۔

☆☆☆

''تم اتنی بے یقین کیوں ہو سجل......؟'' عظام پارک میں سجل کے سامنے کھڑا تھا اور وہ بینچ پر بیٹھی تھی۔ اس کی لانبی پلکوں میں موتی اٹکے ہوئے تھے جو ہولے سے لرزتیں تو موتی رخساروں پر لڑھک آتے۔ عظام بے چین سا ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا سجل تم خاموش کیوں ہو، میرا اعتبار کرو سجل، میں زندگی کے کسی موڑ پر تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔''

ثمر حیات جلد از جلد سجل کی والدہ سے ملنا چاہتا تھا۔

اس لیے عظام نے اسے فون کر کے شاہجہان کے متعلق معلوم کیا تو سجل نے بتایا کہ اماں تو آ گئی ہیں لیکن وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔

''زہے نصیب...... کہو تو ابھی آ جاؤں......'' وہ شوخ ہوا تھا۔ ''یوں بھی ملنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔''

''نہیں ابھی نہیں، میں صبح فون کر کے بتاؤں گی۔'' اور ناشتا کر کے جوں ہی وہ اٹھا تھا اس کا فون آ گیا تھا کہ وہ پارک میں اس کا انتظار کر رہی ہے اور وہ فوراً ہی گھر سے نکل آیا تھا اور اب وہ پارک میں اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کی پلکوں پر موتی اٹکے ہوئے تھے اور وہ بہت بے چین اور مضطرب سی کبھی انگلیاں مسلتی کبھی ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر لیتی۔

''کیا تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے؟'' اس نے پوچھا تھا لیکن وہ یونہی خاموش بیٹھی رہی تھی۔

''تمہارے ذہن میں کیا ہے سجل...... کھل کر بات کرو...... اپنے وہم، شکوک مجھ سے ڈسکس کرو، میں کوشش کروں گا کہ تمہیں مطمئن کر سکوں۔''

وہ اس کے سامنے درخت کے ایک جھکے تنے پر بیٹھ گیا تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں درختوں سے چھن، چھن کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ عظام کی نگاہیں اس کے چہرے کی طرف اٹھیں اور پھر جھکنا بھول گئیں۔ کئی لمحے یوں ہی گزر گئے۔ اس کی نگاہوں کی حدت سے گھبرا کر سجل نے اپنی جھکی پلکیں اٹھائیں اور پھر جھکا لیں۔

''کہو سجل کیا کہنا چاہتی ہو۔ بولو پلیز جو بھی کہنا ہے کہو...... جب سے آیا ہوں خود ہی اندازے لگا رہا ہوں لیکن خدارا کوئی ایسی بات مت کہنا جو......'' عظام نے پریشان سا ہو کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اور اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ اس کے اور سجل کے درمیان کوئی عہد و پیمان تو نہیں ہوئے تھے۔ ہاں اس کے دل نے اس کی چاہ ضرور کی تھی اور سجل نے خود ہی دستِ طلب دراز کر دیا تھا۔

''میں...... مجھے آپ سے معذرت کرنا تھی۔''

''کس بات کی؟'' عظام کی خوشنما آنکھوں میں حیرت تھی۔

''میں نے آپ سے ایک ایسا تعلق جوڑنے کی درخواست کی جس کی آپ کو خواہش نہ تھی۔''

سنہری کے منع کرنے کے باوجود وہ عظام سے بات کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

''ہم انسان بہت خود غرض ہوتے ہیں...... میں بھی خود غرض ہو گئی تھی...... میں نے بھی اپنی غرض پوری کرنا چاہی اور آپ کے سامنے دامن پھیلا دیا۔ آپ ہمدردی اور مروت میں ایسا وعدہ کر بیٹھے جسے نبھانا آسان نہیں ہے، مجھے یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا تھا کہ آپ کی نرم دلی سے فائدہ اٹھاؤں۔ میں آپ کو اس وعدے سے آج آزاد کرتی ہوں۔''

''کیسی بات کر رہی ہو سجل...... میں نے تم سے ہمدردی نہیں کی...... میں نے شاید تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ تم میرا

خواب تھیں...... میں تو حیران تھا اور ابھی تک حیران ہوں کہ کیا خوابوں کی تعبیریں یوں بھی مل جایا کرتی ہیں۔'' اس نے سجل کو بے حد محبت سے دیکھا۔

''کچھ خواب، بہت خوش رنگ، خوشنما اور خوب صورت ہوتے ہیں لیکن ان کی تعبیریں بہت بھیانک ہوتی ہیں...... سیاہ اندھیری راتوں جیسی...... نہ میرا بیک گراؤنڈ قابلِ تعریف ہے اور نہ میری ذات میں کچھ ایسا ہے جو باعثِ فخر ہو...... میرا ساتھ آپ کے لیے باعثِ ندامت ہوگا...... میں نے آپ کو آزمائش میں ڈالا اس کے لیے معافی چاہتی ہوں۔'' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''سجل......'' عظام نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

''مت کہو ایسا...... تم نے مجھے بالکل بھی آزمائش میں نہیں ڈالا میرا یقین کرو...... تم میری طلب ہو...... خواہش ہو، میں نے تم سے کوئی ہمدردی نہیں کی ہے۔ ہمدردی کے رشتے بہت کمزور اور بودے ہوتے ہیں، میرا رشتہ وقتی نہیں ہے، کمزور نہیں ہے، یہ ہمدردی کا رشتہ نہیں ہے، محبت کا رشتہ ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں، میری روح میں سما چکی ہو تم۔''

''مجھ جیسا بیک گراؤنڈ رکھنے والی لڑکی سے کوئی احمق، نادان، کم فہم ہی رشتہ جوڑ سکتا ہے۔'' وہ ابھی تک خود ترسی کی سی کیفیت میں تھی۔ ''میں نے بہت سوچا اور مجھے لگا آپ جیسے اچھے انسان کے ساتھ یہ زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔''

''اور میں...... مجھے لگتا ہے کہ مجھے اس کے لیے سجدۂ شکر ادا کرنا چاہیے بلکہ مجھ پر واجب ہو گیا۔'' اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔

''آپ سمجھ نہیں رہے ہیں، آپ اتنے احمق تو نہیں لگتے مجھے۔'' وہ جھنجلائی۔

''تم مجھے احمق، نادان، کم فہم کچھ بھی سمجھ لو سجل لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں کبھی مایوس نہیں کروں گا۔ ایک مضبوط بندھن میں بندھنے کے بعد یہ محبت جو میں تم سے کرتا ہوں مزید بڑھے گی اور نکھرے گی...... تم مجھ پر اعتماد کرو گی تو زندگی بہت خوب صورت ہو جائے گی۔'' عظام نے وارفتگی سے اسے دیکھا۔

''اور آپ...... کیا آپ بھی مجھ پر اعتبار کریں گے۔ زندگی کا حسن تو باہمی اعتماد سے ہی نکھرتا ہے۔ اور آپ کیا ایک ایسی لڑکی پر اعتبار کر سکیں گے جسے اپنے باپ کا نام تک نہیں معلوم...... میری ولدیت کے خانے میں جس ظہورے کا نام لکھا ہے وہ میرا باپ نہیں ہے۔'' آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں ستاروں کی طرح چمکے......

''یہ بات تم مجھے بتا چکی ہو سجل اور میں نے دل کی پوری رضامندی کے ساتھ تمہاری طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔ محبت میں اس سب سے کچھ فرق نہیں پڑتا...... یوں آنسو بہا کر میرا امتحان مت لو...... اگر میں کوئی گستاخی کر بیٹھا تو تم خفا ہو جاؤ گی۔'' اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

سجل نے تیزی سے اپنے آنسو پونچھے اور بھیگی پلکیں اٹھائیں۔

''آپ کو تو فرق نہیں پڑتا پر کیا آپ کے پاپا کو بھی نہیں پڑتا؟'' اس کے لہجے سے خدشے اور خوف جھلکتا تھا۔

''میرے پاپا دنیا کے سب سے زیادہ اچھے پاپا ہیں اور انہیں میری رضا اور خوشی کائنات کی ہر شے سے بڑھ کر ہے۔'' مسکراہٹ نے دھیرے سے اس کے لبوں کو چھوا تھا۔ اور وہ مبہوت سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''اگر تسلی ہو گئی ہو تو پاپا کو بھیج دوں؟'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی اور سجل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنی پلکیں گرا لیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شرمگیں سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اب وہ حسن و حیا کے اس امتزاج کو مبہوت ہو کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

''کیا آج شام پاپا کو بھیج دوں؟''

''اماں سے پوچھ کر فون کر دوں گی، کیا خبر انہیں کہیں جانا ہو۔''

''زیادہ انتظار نہ کروانا سجل، پاپا اپنی ہونے والی بہو سے ملنے کو بے تاب ہو رہے ہیں، وہ صرف میری خاطر آئے ہیں ابھی، باہر اُن کے کئی کام ادھورے پڑے ہیں، سب کچھ وائنڈ اپ کر کے اب وہ یہاں ہی پاکستان میں سیٹل ہو جائیں گے۔'' عظام بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

''کہاں کس شہر میں سیٹل ہوں گے وہ؟''

''جہاں میری زندگی رہنا پسند کرے وہاں ہی سیٹل ہو جائیں گے۔'' عظام کی شوخ نظریں اس کی طرف اٹھیں تو اس کے رخساروں پر بکھری لالی گہری ہوئی۔

''مجھے لاہور اچھا لگتا ہے۔''

''تو لاہور ہی میں ڈیرا ڈال لیں گے۔'' عظام نے دلچسپی سے اسے دیکھا کچھ دیر پہلے والا اضطراب اب اس کے چہرے سے نہیں جھلکتا تھا۔ وہ دونوں ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے پارک کے خارجی دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ دونوں کے دل یکساں رفتار سے دھڑک رہے تھے۔

''مجھ سے کبھی بدگمان مت ہونا سجل...... میں تمہارے ساتھ عمر بھر کے لیے رشتہ جوڑنے جا رہا ہوں۔'' عظام نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی کروائی۔

سجل کی پلکیں ایک بار پھر نم ہونے لگیں۔

''پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اس رشتے کی بنیاد رکھنا...... اپنے آپ کو کبھی کمتر مت سمجھنا۔ تم میرے دل کی ملکہ ہو اور ہمیشہ میرے دل پر راج کرو گی...... تم نہیں جانتیں تم میرے شب و روز پر قابض ہو چکی ہو...... میرے دن اور رات میری صبحیں اور شامیں تم سب پر حکومت کر رہی ہو۔'' کم گو سے عظام کے پاس جانے کہاں سے اتنے لفظ آ گئے تھے۔ وہ خود سوچ رہا تھا۔ رواحہ اگر سنتا تو مارے حیرت کے بے ہوش ہو جاتا۔ عظام کے دل میں رواحہ کا خیال آیا تو مسکراہٹ نے پھر ایک بار اس کے لبوں کو چھوا۔ بہت زیادہ بولنے والا رواحہ بھی ارتقاع کے سامنے گنگ ہو جاتا تھا۔

''ابھی تم چھوٹی ہو، بہت معصوم ہو۔''

''میں بیس سال کی ہونے والی ہوں۔'' سجل نے پلکیں جھپک کر آنسوؤں کو باہر نکلنے سے روکا۔

''اگر تمہاری اماں کو جلدی نہ ہوتی تو میں تم سے کہتا تم...... بی اے کر لو، میچور ہو جاؤ...... میں بھی اپنی تعلیم مکمل کر لوں لیکن ان حالات میں تو جی چاہتا ہے کہ کل ہی مولوی پکڑ کر لے آؤں اور تمہیں اس دنیا سے دور لے جاؤں جہاں کسی بخاری صاحب اور کسی صاحبزادہ صاحب کی گندی نظریں تم پر نہ پڑیں۔''

''میں اب بھی میچور ہوں...... سنہری سے زیادہ......'' اس نے ناراض سی نظر عظام پر ڈالی اور عظام کا جی اس پر فدا ہو جانے کو چاہا۔

''ایسی نظروں سے مت دیکھو سجل، ورنہ میں تو یہیں ڈھیر ہو جاؤں گا۔'' ذرا سا رک کر اس نے وارفتگی سے سجل کو دیکھا۔ بارِ حیا سے سجل کی نظریں جھک گئیں۔

''سنہری صحیح ہی تو کہتی ہے کہ میں بہت خوش قسمت ہوں، اماں نے ناچنے گانے سے دور رکھا اس ماحول میں رہ کر بساط بھر پڑھایا اور اب یہ شہزادوں کی سی آن بان والا مجھ سے ایک مضبوط تعلق جوڑنے جا رہا ہے۔'' اس نے چور نظروں سے عظام کی طرف دیکھا اور پھر سے اپنی طرف دیکھتے پا کر نظریں جھکا لیں اور تیز، تیز چلنے لگی۔

☆☆☆

خدا بخش کو اپنے لیے چائے بنانے کا کہہ کر وہ رواحہ کے بیڈ روم میں آئے تو وہ سو رہا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ گھر پر ہوتے تو دس ساڑھے دس بجے چائے ضرور پیتے تھے...... آج چھٹی کا دن تھا اور وہ گھر پر ہی تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ

رواحہ کے ساتھ گپ شپ لگاتے وہ چائے پئیں گے...... کچھ دیر وہ رواحہ کے بیڈ کے پاس کھڑے اسے دیکھتے رہے جھک کر اس کا کمبل درست کیا اور پاس پڑی روم چیئر پر بیٹھ گئے۔ ان کا جی چاہا وہ اس کے ماتھے پر بکھرے سلکی بالوں کو پیچھے کر دیں لیکن اس کی نیند ڈسٹرب ہونے کے خیال سے انہوں نے خود کو روک لیا۔ وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ برسوں پہلے اس ننھے بچے کو کراچی لاتے ہوئے وہ سوچ رہے تھے کہ کیا تنہا کسی عورت کے بغیر وہ اسے پال لیں گے اور آج وہی ننھا بچہ ایک بھرپور جوان تھا۔ وہ ایک بار پھر محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگے اور اس کی طرف دیکھتے، دیکھتے منظر بدل گیا تھا۔ وہ رات کے اڑھائی بجے ویران روڈ کے کنارے کھڑے اس چھوٹے سے بچے کو دیکھ رہے تھے جو سہما ہوا تھا اور بار، بار پیچھے مڑ کر اس پگڈنڈی کی طرف دیکھتا تھا جو اس کے پیچھے شاید کہیں کسی آبادی کی طرف جاتی تھی اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان تھے۔ چہرہ ستا ہوا اور آنکھوں میں خوف اور وحشت تھی۔ وہ بے اختیار زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے تھے اور اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا تھا۔

''کیا ہوا بیٹا...... آپ کون ہو؟ آپ کے ماما، بابا کدھر ہیں؟''

''ماما، بابا...... اماں۔'' بچے کے منہ سے بے ربط سے لفظ نکلے تھے۔ پیچھے جنگل میں کہیں کوئی گیدڑ چیخے تھے۔ وہ سہم کر یک دم ہی اُن سے لپٹ گیا تھا۔ انہوں نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا اور وہ سہما ہوا سا بے جان سا ہو کر اُن کے بازوؤں میں سما گیا تھا۔ وہ اڑھائی تین سال کا ہوگا۔

''شاید اپنے والدین سے بچھڑ گیا ہے۔'' انہوں نے مڑ کر خدا بخش سے کہا تھا۔

''پتا نہیں انسان کا بچہ ہے یا......'' اور خدا بخش کی بات پر وہ ہنس دیے تھے۔

''اتنا چھوٹا بچہ خود بہت دور سے نہیں آسکتا خدا بخش...... آس پاس سے پتا کرتے ہیں کیا خبر اس کے والدین اسے ڈھونڈ رہے ہوں۔''

''یہاں آس پاس تو کسی آبادی کا نشان نہیں ہے۔'' خدا بخش صحیح کہہ رہا تھا۔ دائیں بائیں کچے راستے جا رہے تھے۔

''کیا خبر کسی بس ویگن سے اترا ہو اور بچھڑ گیا ہو۔'' خدا بخش نے خیال ظاہر کیا۔

انہیں خدا بخش کے اس خیال سے اتفاق تھا لیکن پھر بھی اس کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے آس پاس اس کے والدین کو ڈھونڈنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگر خدا بخش کا اندازہ صحیح بھی تھا کہ وہ کسی بس سے والدین کی نظر بچا کر اتر گیا ہوگا تو وہ یقیناً اس کی گم شدگی کا احساس ہوتے ہی واپس اسے ڈھونڈنے آئیں گے۔ بچہ ان کی گردن میں بازو ڈالے بری طرح ان سے چمٹا ہوا تھا۔ اس نے بلونیکر کے ساتھ ریڈ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے پاؤں میں قیمتی جاگرز تھے۔ انہیں خدا بخش کا خیال صحیح لگا کہ وہ کسی بس یا ویگن سے ہی نیچے اترا ہوگا اس کا لباس بتا رہا تھا کہ وہ کسی دیہات کا بچہ نہیں ہے۔ پھر بھی انہوں نے دونوں اطراف میں دو میل تک ضرور دیکھا تھا۔ دائیں، بائیں بنے کچے راستوں پر بھی کافی آگے تک گئے تھے لیکن کوئی ذی روح نہیں تھا...... آخری راتوں کا چاند تھا۔ آگے بڑھنے پر اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ کچے راستوں کے اطراف گھنے درختوں کی بہتات تھی۔ تب انہوں نے اسے اپنے ساتھ ہی لے جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ خدا بخش کی بے چینی بھی محسوس کر رہے تھے۔

''خدا بخش ابھی لاہور چلتے ہیں، کل دن کی روشنی میں آکر پتا کر لیتے ہیں۔''

خدا بخش نے سر ہلاتے ہوئے بچہ اُن کی گود سے لے لیا۔

''یہ بہت دور سے آرہا ہے صاحب اس کا جسم بہت گرم ہے اور یہ نڈھال ہو رہا ہے۔''

وہ سر ہلا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔ ڈرائیو کرتے ہوئے وہ گاہے گاہے پیچھے مڑ کر دیکھتے وہ آنکھیں بند کیے نڈھال سا خدا بخش کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ ''جانے کس کا جگر گوشہ ہے اور اس کے والدین کا کیا حال ہوگا۔'' ان کا دل......

بے حد گداز ہو رہا تھا۔ گھر آ کر خدا بخش نے نیم گرم پانی سے اس کا ہاتھ منہ دھلایا...... اور جب جاگرز اتارے تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس کے ننھے، ننھے پاؤں بے حد سوجے ہوئے تھے۔ یقیناً بچہ اپنی طاقت اور ہمت سے زیادہ چلا تھا۔ خدا بخش نے اسے گرم دودھ بہ مشکل پلایا تھا۔

''کیا کھائے گا میرا بیٹا؟'' انہوں نے اسے اپنے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے کتنی بار محبت سے پوچھا تھا لیکن وہ ہونٹ بھینچے بیٹھا رہا تھا۔ خدا بخش اس کے لیے فرنچ ٹوسٹ بنا کر لے آیا لیکن اس نے ایک نوالہ تک نہیں لیا۔

''آپ کا نام؟''

''روحا......'' اس نے اپنی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

''پاپا نام۔''

''پاپا، ماما فلی...... اماں تین۔''

باقی کے نام اس نے خود ہی بتا ڈالے تھے۔ وہ پورا جملہ نہیں بولتا تھا حالانکہ اتنی عمر کے بچوں کو انہوں نے پورے، پورے جملے بولتے دیکھا تھا'' شاید خوفزدہ ہے ڈرا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا ڈر ختم ہو تو کچھ بتائے...... شہر کا نام...... کوئی جگہ کچھ تو بتائے'' انہوں نے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔

''اب سو جاؤ، صبح پاپا کے پاس جائیں گے۔'' انہوں نے اس کے سلکی بالوں میں انگلیاں پھیریں اس کی خوشنما آنکھیں انہیں کچھ مانوس سی لگیں۔ اور وہ محبت سے اسے دیکھنے لگے تھے۔ اور وہ جواب تک ضبط کیے ہوئے تھا چیخ، چیخ کر رونے لگا تھا۔ اور اس کی زبان سے ماما، پاپا نکل رہا تھا۔

''ماما پاس......'' وہ مچل رہا تھا انہوں نے اسے گود میں لے لیا اس کے رخساروں اور ماتھے پر بے اختیار بوسے دیے...... تسلی بھرے کئی جملے بولے اور وہ روتے، روتے یونہی اُن کی گود میں سو گیا تھا۔ سوتے میں بھی اس کی سسکیاں نکل جاتی تھیں۔ اس کے چہرے پر خوف تھا اور کبھی، کبھی وہ سسک اٹھتا اور بے قراری سے اماں، ماما پکارتا تھا۔ اس کے پاس لیٹے۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے، پھیرتے جانے وہ خود بھی کب سو گئے تھے۔ صبح وہ اس کے رونے کی آواز پر اٹھے تھے۔ وہ بیڈ پر بیٹھا آنکھیں رگڑ، رگڑ کر رو رہا تھا۔ انہوں نے اسے بہلایا، پیار کیا لیکن اب جو اس نے رونا شروع کیا تھا تو چپ ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''ماما پاس...... اماں پاس......'' وہ ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ تب ناشتا کر کے اسے اور خدا بخش کو ساتھ لے کر وہ گھر سے نکل گئے تھے۔ اور ایک بار پھر آس پاس کی آبادی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ آتی جاتی ایک دو بسوں کو بھی روک کر اُن کے ڈرائیور سے پوچھا تھا اور پھر گاڑی اس کچے راستے کی طرف موڑ دی تھی جدھر سے وہ بچہ آیا تھا۔ کافی آگے جا کر ایک پیپل کے درخت کے نیچے انہیں ایک شخص نظر آیا۔ جو لوہے کی ایک پرانی سی زنگ آلود سی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کروایا کہ وہ نائی ہے اور یہاں لوگوں کی حجامت بناتا ہے۔ دور چند ایک کچے گھر نظر آ رہے تھے۔ شاید یہ کوئی چھوٹی سی ڈھوک (گاؤں) تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کسی بچے کی گم شدگی سے لاعلم ہے۔ کوئی بچہ گاؤں سے غائب ہوتا تو اسے پہلے خبر ہوتی۔

''اگر کوئی کسی بچے کو ڈھونڈتا ہوا آئے تو اسے یہ نمبر دے دینا۔'' انہوں نے اپنا فون نمبر اسے دے کر تاکید کی تھی۔ وہ نمبر سنبھال کر رکھے اور بچہ ڈھونڈنے والے کو بتا دے کہ بچہ ہمارے پاس محفوظ ہے۔

لاہور واپس آتے ہی انہوں نے سب سے پہلے ایک اخبار میں اشتہار لکھوایا تھا...... پھر ریڈیو پر اعلان کروانے کا انتظام کیا...... ان دنوں شام کے وقت گم شدہ بچوں کے متعلق ریڈیو سے اعلان ہوتا تھا۔

(جاری ہے)